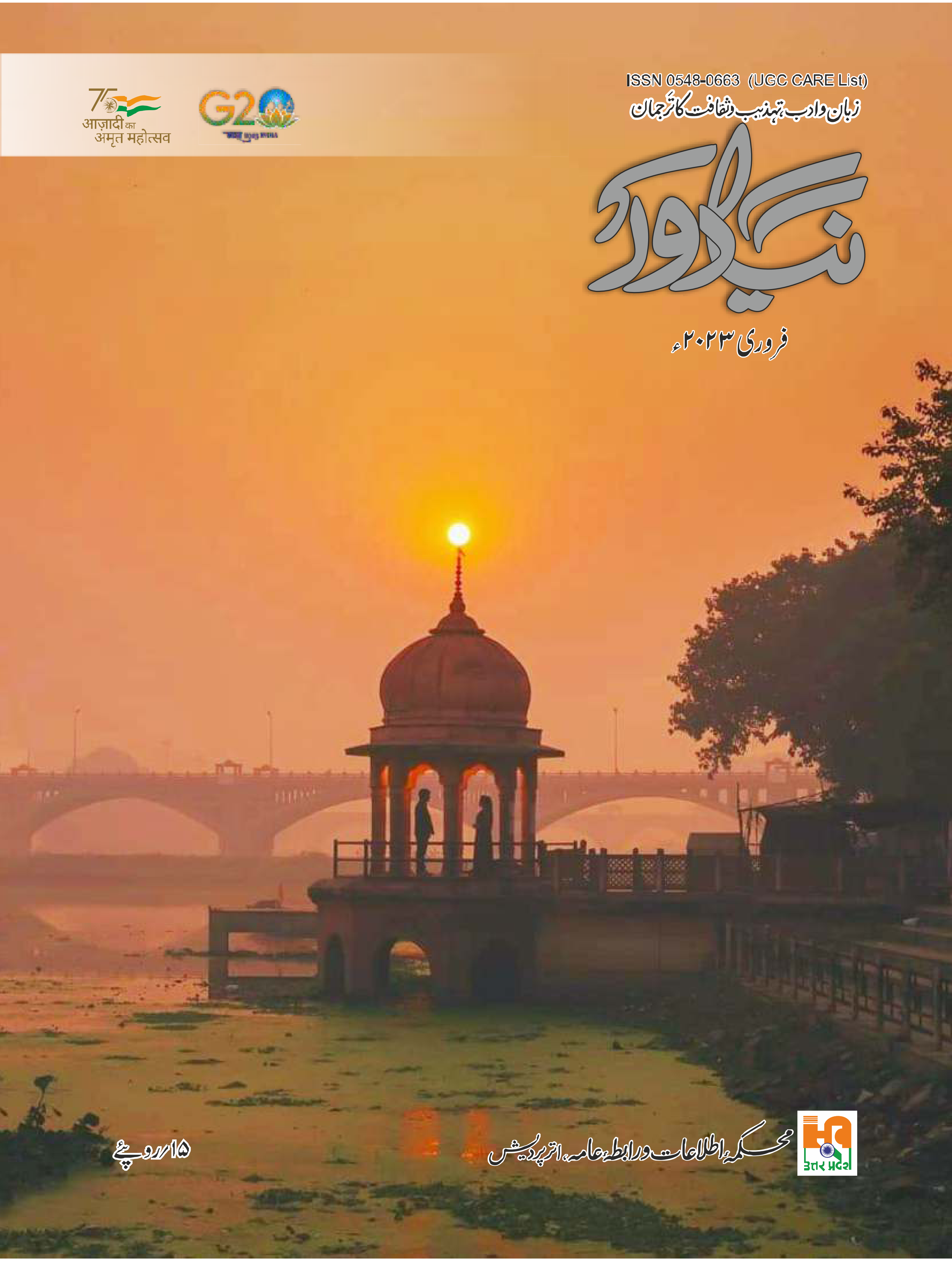

आज़ादी का अमृत महोत्सव

G20

ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

نیا دور

فروری ۲۰۲۳ء

محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اترپردیش

उत्तर प्रदेश

۱۵ روپے

جناب وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ گورکھپور میں این سی سی کیمپ میں جوانوں کے ساتھ اجتماعی پوز دیتے ہوئے۔

جناب وزیراعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ گورکھپور نگرنگم صفائی 'وَین' کو ہری جھنڈی دکھا کر روانہ کرتے ہوئے۔

جلد:77 شمارہ:10

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

فروری ۲۰۲۳ء

سرپرست

جناب سنجے پرساد

پرنسپل سکریٹری، محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

پبلشر: ششر (ڈائرکٹر، انفارمیشن)

جناب انشمان ترپاٹھی (ایڈیشنل ڈائرکٹر، انفارمیشن)

ادارتی مشیر

محترمہ کُمکُم شرما (ڈپٹی ڈائرکٹر، انفارمیشن)

ایڈیٹر

ریحان عباس

رابطہ:9838931772

Email:nayadaurmonthly@gmail.com

معاون: شاہد کمال

رابطہ برائے سرکولیشن وزرِ سالانہ:

صباعرفی:7705800953

آسیہ خاتون

تزئین کار: ایم۔ایچ۔ندوی

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج لکھنؤ

شائع کردہ: محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

زرِ سالانہ: ۱۸۰ روپے

ترسیل زر کا پتہ

ڈائرکٹر انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پنڈت دین دیال اُپادھیائے سوچنا پریسر، پارک روڈ،

اتر پردیش لکھنؤ 226001

Pleas send Cheque/Bank Draft in favour of Director,Information & Public Relations Department,Pandit Deendayal Upadhyay Soochna Parisar,UP,Lucknow

خط وکتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیادور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعہ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ

ایڈیٹر نیادور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش لکھنؤ 226001

ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

اس شمارے میں...

اداریہ		
اپنی بات		۲
مضامین		
ادب میں تخلیقیت: کچھ بنیادی مباحث	ڈاکٹر رضوان الحق	۳
فارسی ادب میں اخلاقی شاعری کی عصری معنویت	ڈاکٹر نیلوفر حفیظ	۶
امتیاز علی عرشی اور ان کے معاصر محققین	ڈاکٹر وسیم احمد انظر	۹
سید محمود الحسن کی انیس شناسی	عذرا رضوی	۱۱
رفیع سرسوی کے شعری رویے اور رجحانات	ڈاکٹر محمد معتبر	۱۶
''زیبرا کراسنگ کے درمیان'' ایک تجزیاتی مطالعہ	فوزیہ سلطانہ	۲۱
منظومات		
غزل	ڈاکٹر حسینہ خانم	۲۳
غزلیں	محمد اسد اللہ/انصر عبقاتی سید حسین ناصر سعید	۲۴
غزلیں	ہمایوں عابد مرزا/جمیل احمد جمیل	۲۵
غزل	خورشید دلدار نگری	۲۷
غزل	ظہیر الہ آبادی	۲۹
افسانے		
مکڑی	راجہ یوسف	۲۶
فریم سے باہر کی تصویر	احمد صغیر	۲۸
اجر	درفشاں چاندنی	۳۰
ترقیات		
ترقیات	ہاشمی رضوی	۳۲

ماہنامہ نیادور، information.up.nic.in ویب سائٹ پر دستیاب ہے۔

قیمت فی شمارہ: پندرہ روپے　　سالانہ رکنیت فیس: ایک سو اسی روپے

دو سال کی رکنیت فیس: تین سو ساٹھ روپے

تین سال کی رکنیت فیس: پانچ سو چالیس روپے

نوٹ: اپنی کمپوز شدہ تخلیقات، مندرج ای میل آئی ڈی پر ہی ارسال کریں۔

E:mail:nayadaurmonthly@gmail.com

نیادور میں شائع ہونے والے تمام ترمشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہرحال ضروری نہیں ہے۔

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

اپنی بات

ماہنامہ نیادور فروری ۲۰۲۳ء کا شمارہ پیش خدمت ہے۔

ماہنامہ نیادور کے قارئین کے لیے فروری ۲۰۲۳ء کا تازہ شمارہ اپنی مکمل اشاعت کے ساتھ پیش کیا جارہا ہے، حالانکہ اس کے شائع ہونے میں تاخیر ضرور واقع ہوئی ہے، جس کے لیے ہم اپنے قارئین سے معذرت گزار ہیں۔ اس کی سب سے اہم وجہ یہ رہی ہے کہ پارلیمانی انتخاب کے ضابطۂ اخلاق کا نفاذ ہوگیا جس کی وجہ سے شمارے کو وقتی طور پر روک دیا گیا تھا، چونکہ اس ادبی رسالے میں حکومت کی پالیسیوں کے متعلق بھی ایک گوشہ شامل ہوتا ہے اور اس کے پشتِ ورق اور اندرونِ ورق پر موجودہ سرکار کے سیاسی رہنماؤں کی تصویریں جلی انداز میں موجود ہوتی ہیں، حالانکہ اس رسالہ کے ادبی ضابطے میں اس طرح کی تصاویر کی اشاعت کا کوئی متعین آئین نہیں ہے لیکن اس کے باوجود رسالہ میں انہیں شامل کیا جاتا ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے نیادور کے سابق مدیران کی زیرادارت یہ سلسلہ شروع ہوا تھا لہٰذا اسی روایت کی تاسی میں اس کو باقی رکھا گیا ہے۔ اسے وقت کی ضرورت بھی کہہ سکتے ہیں یا اردو زبان و ادب کے نام سے شائع ہونے والے سرکاری رسالوں کی روایت، اس لیے کہ یہ رسالہ مکمل طور پر سرکار کی کفالت اور اس کے زیرنگرانی شائع ہوتا ہے، سرکاری نگرانی اور اس کے مالی تعاون کے بغیر اس کی اشاعت ناممکن ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی عرض کرتا چلوں کہ اتر پردیش حکومت اردو زبان اور اس کے فروغ کے لیے متحرک نظر آرہی ہے اور ان کے منشور میں ریاست کی دیگر زبانوں کی طرح اردو زبان و ادب کی نشرواشاعت اور اس کے فروغ کے لیے باضابطہ مختلف شعبہ جات میں اس کے انتظام وانصرام کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت کی طرف سے اردو زبان کے لیے بھی سرکار کی طرف سے مختلف اسکیمیں بھی چلائی جاتی ہیں جس سے اردو زبان سے متعلق افراد مستفیض ہوتے ہیں۔

ماہنامہ نیادور بھی اُسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ خاص کر اس رسالہ میں اُن قلم کاروں اور تخلیق کاروں کا خصوصی خیال رکھا جاتا ہے جو کسی یونیورسٹی یا کالج میں بحیثیت اسکالر ریسرچ کرتے ہیں، اُن کے تحقیقی اور تنقیدی مسودات کو شائع کیا جاتا ہے اس کے علاوہ اردو سے متعلق جو بھی تخلیق کار اور قلم کار اپنی نگارشات ماہنامہ نیادور کو ارسال کرتے ہیں بطورِ ایڈیٹر ہماری یہ پہلی ذمہ داری ہوتی ہے کہ اُن تخلیقات کو شامل اشاعت کیا جائے اور اس کو شائع کرنے میں مزید تاخیر نہ کی جائے۔ ہمیں اس بات کا مکمل احساس ہے کہ کسی بھی تخلیق کار یا قلم کار کو اپنی نگارشات کو شائع کرانے کے لیے بار بار یاددہانی نہ کرانی پڑے، اور ہم اس بات کو اپنے ترجیحات میں شامل رکھتے ہیں کہ جو تحریری مسودات و معروضات ہمارے رسالہ کے ادبی معیار پہ کھری اترتی ہیں، ہم صرف انہی کو اس رسالہ میں جگہ دیتے ہیں۔

امید ہے کہ مذکورہ شماروں کی طرح اس شمارے کی بھی آپ پذیرائی کریں گے اور اپنی مفید آرا سے ہمیں مطلع کریں گے۔

ریحان عباس

یہ شمارہ فروری ۲۰۲۳ء کا ہے جس کو جون ۲۰۲۴ء میں شائع کیا جارہا ہے۔

ڈاکٹر رضوان الحق

اسسٹنٹ پروفیسر سی آئی ای ٹی، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

9977006995

ادب میں تخلیقیت: کچھ بنیادی مباحث

ادب میں تخلیقیت کیا ہوتی ہے؟ کیا غیر تخلیقی ادب بھی ہوتا ہے؟ کیا ادب میں تخلیقیت کو جانچنے کا کوئی معروضی پیمانہ ہوسکتا ہے؟ اگر ہاں! تو وہ کون کون سی باتیں ہوسکتی ہیں جن کی بنیاد پر اس کی تخلیقیت کو پرکھا جا سکتا ہے؟ یہی سب وہ سوال ہیں جن کے جواب اس مقالے میں تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ادب میں تخلیقیت ایک ایسا تصور ہے جس کی ایک طرف حقیقت کی ٹھوس دیوار ہے، تو دوسری طرف تخیل کی بیکراں اڑانیں ہیں۔ ادب کو ان دونوں کے درمیان ایک توازن قائم کرنا ہوتا ہے۔ اسے جہاں ایک طرف خالص سماجی حقیقت نگاری سے بچنا ہوتا ہے، وہیں دوسری طرف خالص تخیل اور ہوا ہوائی سے بھی بچنا ہوتا ہے، تبھی ادب میں اچھی تخلیقیت پیدا ہوسکتی ہے۔ لیکن ادب میں تخلیقیت کو سمجھنے سے قبل ہمیں خود تخلیقیت کے بارے میں بنیادی باتیں سمجھ لینی ہوں گی تبھی ادب میں تخلیقیت پر کوئی بامعنی بات ممکن ہوسکے گی۔ تخلیقیت کے بارے میں Infinity Learn میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

> ”تخلیقیت تب وجود میں آتی ہے جب اسے کچھ کرنے کی نئی ہیئت یا طریقۂ کار ملتے ہیں۔ یہ آپ کو کچھ منفرد سوچنے کی اجازت دیتی ہے، جس سے بہتر تنقیدی مہارت کی ترقی میں مدد ملتی ہے۔ یہ پرانی سوچ کی عادت کو تبدیل کر دیتی ہے اور نئے یا جدید فکر کے اسالیب سے تعارف کراتی ہے۔ آپ کتنے الگ طریقے سے سوچ سکتے ہیں، آپ کے خیالات کتنے موثر اور تازہ ہیں یہ تخلیقیت کا جادو ہے۔ یہ آپ کی شخصیت میں بھی اضافہ کرتی ہے۔“[1]

تخلیقیت کی یہ تعریف تخلیقیت کے بارے میں بنیادی باتیں فراہم کرتی ہے۔ اور بتاتی ہے کہ تخلیقیت کی بنیادی شرط نیا پن ہوتا ہے۔ یہ نیا پن ہیئت کی سطح پر بھی ہوسکتا ہے، فکر و نظر کی سطح پر بھی ہوسکتا ہے اور طریقۂ کار کی سطح پر بھی ممکن ہے۔ کسی بھی شے کے بارے میں پرانی اور روایتی سوچ کو ترک کر کے اس میں تازہ کاری لانا تخلیقیت کی بنیادی شرط ہے۔ اس تعریف سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تخلیقیت پرانی فکر کو ترک کر کے نئی اور جدید فکر کے لیے جگہ بناتی ہے۔ اس سے ایک نتیجہ یہ بھی نکالا جاسکتا ہے کہ زندگی میں تبدیلیوں کے لانے میں بھی تخلیقیت بہت معاون ہوتی ہے۔ یہاں یہ بات دھیان رکھنے کی ہے کہ یہ تعریف ادب میں تخلیقیت کے بارے میں نہیں ہے بلکہ عام زندگی میں تخلیقیت کے بارے میں کہی گئی ہے۔ انگریزی کی معروف ویب سائٹ ویکی پیڈیا میں تخلیقیت یعنی creativity کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

> ”تخلیقیت ایک صورت حال ہے، جس کے ذریعے کچھ نیا اور قیمتی وجود میں آتا ہے، تخلیق کردہ شے خیال بھی ہوسکتی ہے (مثلاً خیال، ایک سائنسی نظریہ، موسیقی کی دھن، یا ایک لطیفہ بھی) یہ ایک جسامت پر مبنی شے بھی ہوسکتی ہے، (مثال کے طور پر کوئی ایجاد، ایک شائع شدہ ادبی کام یا کوئی مصوری کا نمونہ)۔“[2]

اس بیان میں تخلیقیت کے بارے میں عام بات کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ کو بھی شامل کیا گیا ہے، ظاہر ہے اس میں ادب بھی شامل ہے۔ اس میں دیگر باتوں کے علاوہ جسامت کی بھی بات کی گئی ہے۔ یعنی اگر عام جسامت سے مختلف جسامت میں کسی چیز کی تخلیق کی جائے تو بھی یہ تخلیقیت ہوگی۔ یہاں ایک بات پر اور زور دیا گیا ہے کہ تخلیقیت کے لیے نیا کے ساتھ قیمتی کی شرط بھی لگا دی گئی ہے۔ یعنی اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ نئے کے نام پر کچھ بھی الٹا سیدھا کر دینا تخلیقیت نہیں ہوتی ہے اسے قیمتی ہونا بھی لازمی ہے۔ کوئی تخلیق قیمتی کیسے ہو جاتی ہے یہ ایک بڑا موضوعی سوال ہے۔ اس بارے میں ہر کسی کی اپنی رائے ہوسکتی ہے۔ لیکن تنقید کا کام اسی مقام پر شروع ہوتا ہے اور وہ معروضی ہو کر طے کرے کہ کوئی تخلیق کتنی قیمتی ہے۔ اب تک ہم نے جو بات کی ہے وہ مغربی فکر کے تناظر میں بات کی ہے۔ اس سلسلے میں اردو میں بھی کچھ مباحث ہوتے رہے ہیں۔ اردو میں تخلیق کے بارے میں ڈاکٹر میر رحمت اللہ لکھتے ہیں:

> ”زبان کی اپنی ایک طے شدہ ہیئت ہوتی ہے، ہر ادیب کا خاندانی پس منظر ہوتا ہے اور سماجی زندگی بھی ہوتی ہے، جہاں سے وہ زبان سیکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر مصنف کے ساتھ اس کی سیکڑوں سال کی روایت بھی ہوتی ہے، جس کی پاسداری بھی اسے کرنی ہوتی ہے۔ زبان کے تعلق سے یہ باتیں اس معاشرے میں سب کے لیے مشترک ہوتی ہیں، لیکن ایک اچھا تخلیق کار اپنی زبان خود بھی تخلیق کرتا ہے۔ اس ضمن میں سامنے کی مثال یہ ہے کہ ایک گھر کے دو بھائی یا بہن ایک جیسی زبان نہیں بولتے یا لکھتے ہیں۔ جب کہ خاندان، سماج اور زبان کی روایت دونوں کی ایک ہونے کے باوجود دونوں کی زبان مختلف ہوتی ہے، تو زبان کی یہی انفرادیت اس کی تخلیقیت ہوتی ہے۔ لیکن جب ہم ادبی حوالے سے بات کرتے ہیں تو زبان کی تخلیقیت سے مراد ہے کہ اس زمانے میں مجموعی طور پر کسی مصنف کی زبان کتنی منفرد ہے“۔

"تخلیق کا مادہ خلق ہے، خلق سے مراد ہے کسی چیز کو تخلیق کرنا، بنانا، پیدا کرنا، وجود میں لانا یا کسی چیز کو جنم دینا، اگریزی میں اس کے لیے create کا لفظ استعمال ہوتا ہے، تخلیق کے لیے انگریزی زبان میں creation کا لفظ استعمال ہوتا ہے، تخلیق کے معنی بھی خلق کرنے کے ہی ہیں، یعنی پیدائش، آفرینش، پیدا کرنا، وجود میں لانا تخلیق سے ہی تخلیقیت لفظ بنا ہے۔"[۳]

جب ہم ادب میں تخلیقیت کے بارے میں بات کرتے ہیں، تو پہلا سوال یہ اٹھتا ہے کہ ادب ایک تخلیق ہی ہوتا ہے۔ تو تخلیق میں تخلیقیت تلاش کرنے سے کیا مراد ہے۔ اس تعلق سے عرض کروں کہ ہم کس تخلیق کو یا ادیب کو بہتر تخلیق کہہ سکتے ہیں اور کس میں تخلیقیت کم ہوتی ہے۔ ظاہر ہے ایسی تحریریں بھی تخلیق کی بنیادی شرط کو پورا کرتی ہیں جن میں تخلیقیت کم ہوتی ہے۔ آسانی کے لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر کوئی تحریر فکشن یا شاعری ہے تو اسے تخلیق کہہ سکتے ہیں اور اس میں لازمی طور پر کچھ نہ کچھ تخلیقیت ہوگی ہی۔ لیکن اگر وہ تحریر تنقید یا تحقیق ہے تو اسے تخلیق نہیں کہہ سکتے۔ ان بنیادی باتوں کو سمجھنے کے بعد ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ کسی 'تخلیق میں تخلیقیت' سے کیا مراد ہے؟ اور کس تخلیق میں زیادہ یا بہتر تخلیقیت کیوں کر وجود میں آتی ہے۔ اور ان کے وسائل کیا ہوتے ہیں؟

کسی ادب میں تخلیقیت کی پہلی اور بنیادی شرط اس کی زبان ہے۔ زبان میں تخلیقیت کا تعلق اس ادیب کے اسلوب سے بھی ہوتا ہے۔ جو ادیب صاحب اسلوب ادیب ہوتا ہے اس کی زبان بہت تخلیقی ہوتی ہے۔ زبان میں تخلیقیت سے مراد ہے کہ ایک ایسی زبان کی تخلیق کرنا، جو بنیادی طور پر تو وہی زبان ہوتی ہے جو زبان سبھی استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اس کے بیان میں ایسی تازگی ہوتی ہے کہ اسے زبان کی روایت میں مختلف کہہ سکتے ہیں، وہ زبان اپنی الگ سے شناخت بنا لیتی ہے کہ اس کا لکھنے والا کون ہے۔ زبان کے ذریعے تخلیقیت، محاورہ اور زبان کے مانوس ڈکشن سے دوری بنا کر پیدا کی جا سکتی ہے۔ ساتھ ہی اپنی تحریر کو محاورہ اور روزمرہ سے بھرپور بنا کر بھی تخلیقیت پیدا کی جا سکتی ہے۔

زبان کی اپنی ایک طے شدہ ہیئت ہوتی ہے، ہر ادیب کا خاندانی پس منظر ہوتا ہے اور سماجی زندگی بھی ہوتی ہے، جہاں سے وہ زبان سیکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر مصنف کے ساتھ اس کی سیکڑوں سال کی روایت بھی ہوتی ہے، جس کی پاسداری بھی اسے کرنی ہوتی ہے۔ زبان کے تعلق سے یہ باتیں اس معاشرے میں سب کے لیے مشترک ہوتی ہیں، لیکن ایک اچھا تخلیق کار اپنی زبان خود بھی تخلیق کرتا ہے۔ اس ضمن میں سامنے کی مثال یہ ہے کہ ایک گھر کے دو بھائی یا بہن ایک جیسی زبان نہیں بولتے یا لکھتے ہیں۔ جب کہ خاندان، سماج اور زبان کی روایت دونوں کی ایک ہونے کے باوجود دونوں کی زبان مختلف ہوتی ہے۔ تو زبان کی یہی انفرادیت اس کی تخلیقیت ہوتی ہے۔ لیکن جب ہم ادبی حوالے سے بات کرتے ہیں تو زبان کی تخلیقیت سے مراد ہے کہ اس زمانے میں مجموعی طور پر کسی مصنف کی زبان کتنی منفرد ہے، اس میں جتنی زیادہ انفرادیت ہوگی اتنی زیادہ اس کی زبان تخلیقی ہوگی، تخلیقی زبان سے مراد یہ قطعی نہیں ہے کہ کسی کی زبان خوب با محاورہ اور روانی سے پر ہو، بلکہ کئی بار محاورہ دار زبان تخلیقیت سے خالی ہوتی ہے۔ ادیب کی زبان اس کی اپنی تخلیق کردہ بھی ہوتی ہے اور اس کی شناخت بھی ہوتی ہے، جس میں ادیب اپنے فکر و خیال کا اظہار کرتا ہے۔ اس میں ذاتی تشبیہ اور استعارے اگر استعمال ہوں تو وہ زبان زیادہ تخلیقی ہوگی۔ اگر تشبیہ اور استعارے وہی استعمال ہو رہے ہیں جو اکثر ادیب کرتے ہیں، تو زبان میں تخلیقیت کی کمی آئے گی۔

ادب میں تخلیقیت کو مجموعی طور پر دو خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ شاعری میں تخلیقیت

۲۔ فکشن میں تخلیقیت

شاعری میں تخلیقیت:

شاعری کی زبان فکشن کے مقابلے میں قواعد اور روایت سے زیادہ آزاد ہوتی ہے، اس لیے اس میں تخلیقیت آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس لیے کہ شاعری کی بنیاد ہی زبان کے بنے بنائے سانچے سے الگ ہوتی ہے، اس میں استدلال سے زیادہ تخیل پر زور دیا جاتا ہے۔ ابہام اور تخیل کی اڑان کو شاعری کی بنیادی شرطوں میں شمار کیا جاتا ہے، تشبیہ، استعمارے علامتیں بھی شاعری میں کثرت سے استعمال ہوتی ہیں۔ اس لیے اگر کوئی تخلیق شاعری ہے، تو اس کی زبان میں بنیادی تخلیقیت تو موجود ہی ہوگی، اس کے بغیر شاعری ممکن ہی نہیں۔ جب کہ شاعری میں تخلیقیت مشکل اس لیے ہوتی ہے کہ ہر شاعری میں تھوڑی بہت تخلیقیت تو ہوتی ہی ہے۔ تیسرے درجے کے شاعر میں بھی تخلیقیت مل ہی جاتی ہے، اور اگر وہ منظوم شاعری ہے تو اس بنیاد پر تخلیقیت میں تھوڑا مزید اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ ہم روزمرہ زندگی میں شاعری میں تو بات کرتے نہیں ہیں، اس کے مقابلے میں شاعری میں نیا پن تو آ ہی جاتا ہے۔ ایسے میں شاعر کے لیے یہ چنوتی ہمیشہ رہتی ہے کہ دوسرے شاعروں کے مقابلے میں اس کی زبان کیسے زیادہ تخلیقی ہو۔ تخلیقیت میں مشکل کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ شاعری کی بحر بھی بنیادی تخلیقیت میں تو مدد کرتی ہے لیکن جب کوئی شاعر ایک نئی زبان تخلیق کرنا چاہتا ہے، صاحب اسلوب شاعر بننا چاہتا ہے تو اسے نثر کے مقابلے میں تخلیقیت نہیں لانی ہوگی بلکہ اسے دوسرے شاعروں کے مقابلے میں تخلیقیت لانی ہوگی اور دوسرے شاعروں کے یہاں بھی بھرپور تخلیقیت ہوتی ہے۔ اسے لیے شاعری میں اچھی تخلیقیت لانا بہت مشکل ہوتی ہے اور وہ ایسی تخلیقیت جو قیمتی بھی ہو۔ شاعری کی بنیادی تخلیقیت شاعر کو آگے جانے میں حائل بھی ہونے لگتی ہے کیونکہ شاعر کو بحر کی پاسداری بھی کرنی ہوتی ہے۔ اس لیے شاعر کو ایسا اسلوب اختیار کرنا مزید مشکل ہو جاتا ہے کہ اس کی تخلیقیت نمایاں ہو سکے۔ شاعری میں تخلیقیت کو سمجھنے کے لیے مرزا غالب اور شیخ ابراہیم ذوق کی مثال سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اردو کی معروف زبان اور محاورے کا ذوق نے بہتر استعمال کیا تھا، بلکہ ذوق کی زبان غالب سے بھی زیادہ با محاورہ اور روزمرہ سے پُر ہے۔ ایک زمانے تک لوگ ذوق کو غالب سے بہتر شاعر مانتے تھے تو یہ محض اتفاق نہیں تھا، اور نہ ہی یہ کچھ لوگوں کا تعصب تھا۔ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ با محاورہ زبان بہتر ترسیل کرتی ہے اس وقت زبان کی روانی پر بھی بہت زور دیا جاتا تھا، اس میں روانی بھی غالب سے زیادہ ہے۔ وہیں غالب کی شاعری میں زبان اور خیال دونوں اعتبار سے ٹھہر کر اور غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔ اس میں قاری کو بھی ایک فعال کردار ادا کرنا پڑتا ہے، ذہن کو بھی زحمت دینی پڑتی ہے۔ اس لیے غالب کے یہاں تخلیقیت ذوق کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ جب کہ دونوں ایک ہی زمانے میں اور ایک شہر میں شاعری کرتے تھے۔ غالب ایک نئی زبان خلق کر رہے تھے جو ہر لفظ پر رک رک کر غور و فکر کی دعوت دیتی تھی، جسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا اور سمجھنا تھا۔ جب کہ ذوق کی زبان فراٹے مارتی دلوں میں اترتی چلی جاتی ہے۔

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

ذوق

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

مرزا غالب

اپنے زمانے میں یہ دونوں شعر بہت مشہور تھے، دونوں شعر بنیادی طور پر ایک ہی واقعے کو بیان کر رہے ہیں۔ ذوق نے مشہور واقعے کو محض منظوم کر دیا ہے۔ جب کہ غالب کے شعر میں ذاتی تجربہ بھی شامل ہوگیا ہے۔ اس لیے غالب کے شعر میں زیادہ وسعت آگئی ہے اور شعر میں تخلیقیت زیادہ ہے۔

اسی طرح کی ایک مثال ترقی پسند تحریک زمانے سے دینا چاہوں گا۔ اخترالایمان اور علی سردار جعفری تقریباً ایک ہی زمانے کے شاعر تھے، دونوں بمبئی میں رہتے تھے۔ دونوں کا آبائی وطن یوپی میں تھا۔ علی سردار جعفری کی زبان بہت بامحاورہ اور بڑی دلکش تھی، وہ بڑے پرشکوہ انداز میں شعر کہتے اور پڑھتے تھے۔ کئی بار لگتا تھا کہ جعفری صاحب شعر پڑھتے رہیں اور ہم سنتے رہیں بس، ضروری نہیں کہ ہم ان کی فکر و معنی میں بھی ڈوبیں۔ اگر اخترالایمان کی شاعری کی زبان سے ان کا مقابلہ کیا جائے تو بظاہر اخترالایمان کی زبان سردار جعفری کے مقابلے بہت معمولی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اخترالایمان شاعری کی اپنی زبان گڑھ رہے تھے، جس اسلوب سے ہم اردو والے مانوس نہیں تھے۔ اخترالایمان کے یہاں تخلیقیت بھرپور ہے، وہ اپنی طرح کے تقریباً واحد شاعری تھے، جو اس طرح کی زبان کا استعمال کر رہے تھے۔ سردار کے یہاں اردو محاورہ، زبان کی روانی اور پرشکوہ الفاظ کا بہتر استعمال ہوا ہے۔ لیکن سردار جعفری کے یہاں انفرادیت نمایاں نہیں ہے، تھوڑے سے فرق کے ساتھ فیض، مجاز، مخدوم اور ساحر کے یہاں بھی وہی فکر اور وہی زبان تلاش کی جاسکتی ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ اخترالایمان کی زبان زیادہ تخلیقی ہے۔

میرا سفر
اور سارا زمانہ دیکھے گا
ہر قصہ مرا افسانہ ہے
ہر عاشق ہے سردار یہاں
ہر معشوقہ سلطانہ ہے

علی سردار جعفری

ایک لڑکا
میں اس لڑکے سے کہتا ہوں وہ شعلہ مر چکا جس نے
کبھی چاہا تھا اک خاشاک عالم پھونک ڈالے گا
یہ لڑکا مسکراتا ہے یہ آہستہ سے کہتا ہے
یہ کذب و افترا ہے جھوٹ ہے دیکھو میں زندہ ہوں۔

اخترالایمان

اخترالایمان کی نظم میں پرشکوہ زبان نہیں ہے، تقریباً مکالموں کے انداز میں بیان ہے۔ یہاں زبان کا بظاہر لطف نہیں ہے لیکن وہ جس کیفیت کو بیان کر رہے ہیں، اسے بیان کرنے میں پوری طرح قادر نظر آتے ہیں۔ جب کہ سردار جعفری کے یہاں بہت مانوس لفظ استعمال ہوئے ہیں، عاشق اور معشوقہ، قصہ اور افسانہ ان سب کا ایک پیکر ہمارے ذہن میں پہلے سے موجود ہے اور ہمیں یہ شاعری فوراً متاثر کرتی ہے۔ لیکن تخلیقیت اور غور و فکر کی دعوت اخترالایمان کے یہاں زیادہ ہے۔ اور ادب میں بہرحال تخلیقیت کی اہمیت مسلم ہے۔

فکشن میں تخلیقیت:

فکشن کی زبان میں تخلیقیت پیدا کرنا ایک مشکل امر ہے کیونکہ فکشن کی زبان استدلالی ہوتی ہے اور اس کی تشکیل سماج میں ہوتی ہے، اس لیے اس میں کچھ ندرت پیدا کرنا آسان کام نہیں ہوتا، پھر بھی صاحب اسلوب فکشن نگار ایسا کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ انتظار حسین کی نثر اس کی بہترین مثال ہے کوئی بھی شخص ان کے فکشن کا تھوڑا مطالعہ کرنے کے بعد آرام سے ان کی نثر کو پہچان سکتا ہے۔ لیکن ان کی تخلیقیت کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد ان کا فارمولا بھی سمجھ میں آنے لگتا ہے، کہ وہ کس طرح سے اساطیر، جاتک کتھائیں، اور دیگر قصے کہانیوں کو اپنے حالات اور زمانے کے ساتھ ہلکے اشاروں سے منسلک کر دیتے ہیں۔ لیکن جب وہ قصے لوگوں کے پاس دوسرے ذرائع سے بھی پہنچنے لگے تو ان کے فارمولے ڈی کوڈ ہونے لگے۔ اور ان کی خوبیوں کا کمال تھوڑا کمزور ہونے لگا۔ قرۃ العین حیدر کے یہاں اگر تاریخ کو نظر انداز کر دیں تو ان کے یہاں کوئی پیٹرن بنتا نظر نہیں آتا، وہ ہر بار تاریخ کے پاس جاتی بھی نہیں ہیں، اس لیے ان کی تخلیقیت کہیں نہ کہیں بچی رہ جاتی ہے۔ وہ محض ماضی میں نہیں رہتی ہیں بلکہ ایک ایسی زبان خلق کرتی ہیں کہ وہ حال سے بھی مکالمہ قائم کرتی ہے۔ زمان و مکان میں تخلیقیت قرۃ العین کا خاص کارنامہ ہے۔

اردو فکشن میں تخلیقیت کے لحاظ سے ایک بہت اہم نام نیر مسعود کا ہے، انھوں نے تو اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ وہ پہلے ڈرافٹ کے بعد ایک بار اس لیے پڑھتے ہیں کہ ان میں کہیں کوئی محاورہ یا روزمرہ تو نہیں آگیا ہے اور اگر ایسا ہے تو وہ اسے کاٹ کر اس کی تصحیح کر دیتے ہیں۔ تو یہ کیا بات ہوئی کہ ایک ادیب اپنی تحریر سے محاورے اور روزمرہ سے گریز کرے انھیں کاٹ کر باہر کر دے، دراصل محاورے اور روزمرہ سے تخلیق کار کی تخلیقیت میں کمی آجاتی ہے، کیونکہ جب تخلیق کار اپنی تخلیق تحریر کر رہا ہوتا ہے۔ ایسے میں اگر محاورے اور روزمرہ آتے ہیں تو صرف وہی بیانیہ کو اپنے مطابق نہیں ڈھال رہا ہوتا ہے بلکہ محاورے اور روزمرہ بھی تخلیق کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے لگتے ہیں۔ نیر مسعود اپنے آس پاس کی زندگی کو نہیں بیان کرتے ہیں بلکہ اکثر گزرے ہوئے یا غیر مانوس زمان و مکان میں لے جاتے ہیں۔ جس سے انھیں ڈی کوڈ کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی فارمولا بنتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن زبان و بیان اور فضا میں اتنی تازگی ہوتی ہے کہ ان کی تخلیقیت کمال کی ہوتی ہے۔

خالد جاوید کا معاملہ یہ ہے کہ آپ ان کے تین افسانوی مجموعے اور چار ناول سب پڑھ جائیے لیکن وہ کسی فارمولے کے ذریعے ڈی کوڈ نہیں کیے جاسکتے ہیں، ان کے کردار اور ان میں موجود زندگی بھی ہمارے آس پاس کی ہی ہے، وہ کسی غیر مانوس زندگی میں نہیں لے جاتے اس کے باوجود ان کا فکشن تخلیقیت میں بہت آگے ہے۔ صدیق عالم بھی اردو فکشن میں بہت اعلیٰ تخلیقی سرچشموں کے ساتھ وارد ہوئے، ان میں اور خالد جاوید میں کئی تخلیقی خوبیاں مشترک بھی ہیں۔ ان کے یہاں بھی خالد جاوید کی طرح خیال کی ندرت بھی خوب ہے اور زبان میں تازگی بھی ہے۔ اگرچہ خالد جاوید کے ناول اور افسانے دونوں میں اس صنف کی خوبیاں کہیں بہتر طریقے سے ابھر کر آتی ہیں۔ صدیق عالم کی زبان بھی کہیں کہیں غیر فطری اور ترجمے جیسی ہونے لگتی ہے۔ ان سب کے باوجود وہ ایک ایسے فن کار ہیں جن کے یہاں بھرپور تخلیقیت نظر آتی ہے۔

حوالہ جات:

1-https://infinitylearn.com/surge/blog/general/role-of-literature-in-enhancing-creativity/

۲۔ https://en.wikipedia.org/wiki/Creativity

۳۔ ڈاکٹر میر رحمت اللہ، اردو ریسرچ جرنل، شمارہ نمبر ۱۷، جنوری تا مارچ ۲۰۱۹، نئی دہلی۔ ص ۵۹

❑❑❑

ڈاکٹر نیلوفر حفیظ

اسٹنٹ پروفیسر فارسی، شعبہ عربی و فارسی، الہ آباد یونورسٹی، پریا گراج

7500984444

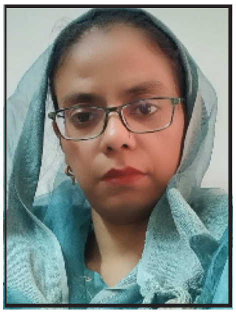

فارسی ادب میں اخلاقی شاعری کی عصری معنویت

فارسی زبان و ادب کے قدیم ادبی سرمایہ پر نگاہ ڈالی جائے تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ فارسی ادب میں دورۂ قدیم سے ہی اخلاقیات کے موضوع کو مرکزی اہمیت حاصل رہی ہے اور اس زبان کے ادب کا ایک بڑا حصہ اخلاقیات پر ہی مشتمل ہے۔ خاص طور پر فارسی شاعری میں تو عرفان و تصوف اور پند و اندرز کا ایسا بیش قیمت اور گرانقدر سرمایہ دیکھنے کو ملتا ہے جس سے صرف اہل ایران نے ہی نہیں بلکہ اس دنیا کی مختلف ملکوں اور اقوام نے بھی استفادہ کیا ہے میں پورے وثوق اور ذمہ داری کے ساتھ دعویٰ کر سکتی ہوں کہ اس زبان کا شاید ہی کوئی ایسا شاعر باقی رہ گیا ہوگا جس نے اپنے اشعار میں اخلاقی موضوعات کو نظم نہ کیا ہو۔ اخلاق و کردار سے تعلق رکھنے والے بے شمار موضوعات مثلاً ادب و احترام، بشریت و انسانیت، عفت و پاکیزگی، محبت و اخوت، عدل و انصاف اور صبر و حلم وغیرہ جیسے متعدد مضامین ہیں جو ابتدائی زمانے سے لے کر عصر حاضر تک کی فارسی شاعروں کے یہاں نظم کیے جاتے رہے ہیں اور یہی وہ موضوعات ہیں جو فارسی شاعری کا طمطراق اور طرۂ امتیاز رہے ہیں، قرین قیاس یہ ہے کہ ابتدائی دور کے فارسی شعراء میں اخلاقی موضوعات کو اپنی شاعری میں جگہ دینے والے شاعروں میں ابوشکور بلخی، حکیم کسائی مروزی، شہید بلخی، عمارہ مروزی اور رودکی سمرقندی وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں ان شاعروں نے اپنے کلام میں بے شمار اخلاقی موضوعات کو جالب و جاذب انداز میں قلم بند کیا ہے، لیکن یہاں یہ بات بھی عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ادبی اعتبار سے فارسی زبان میں اخلاقی شاعری کی باضابطہ شروعات محمد بن محمود بدایعی سے ہوتی ہے اس شاعر بزرگ نے "پند نامہ" کے نام سے انوشیرواں کے عہد کی ایک اخلاقی کتاب کو شعر کا قالب عطا کیا تھا افسوس اس کتاب کے حوالے تو جا بجا کتابوں میں دیکھنے کو مل جاتے ہیں لیکن اصل کتاب کا کہیں سے کوئی پتہ نہیں چلتا ہے لہٰذا اس کتاب کی اصل قدر و قیمت کا تعین قدرے دشوار ہے۔

فارسی شاعری میں اخلاقی موضوعات میں بے پناہ وسعت اور تنوع پایا جاتا ہے جس کی سب سے بڑی اور اہم وجہ یہ ہے کہ ایرانیوں کی زندگی کے ہر شعبے میں اسلامی تعلیمات اور مذہبی افکار کی کارفرمائی رہی ہے اس کے علاوہ صوفیانہ رجحانات اور نظریات نے بھی ایران کی اخلاقی شاعری کو ثروت مند اور غنی تر بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ فارسی ادب کی تمام شعری اصناف خواہ قصیدہ ہوں یا مرثیہ، نظم ہوں یا غزل، مثنوی ہو یا رباعی ہر جگہ اخلاقی تعلیمات کا بیش قیمت خزانہ دیکھنے کو ملتا ہے، لیکن قابل ذکر اور اہم بات یہ ہے کہ فارسی ادب کی جس شعری صنف میں اخلاقی موضوعات کو سب سے زیادہ شدت اور چابکدستی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے وہ مثنوی گوئی ہے یعنی فارسی شاعری کا بیشتر اخلاقی سرمایہ مثنویات پر مشتمل ہے مثلاً شاہنامہ فردوسی، بوستان سعدی، مثنوی مولانا روم، مخزن الاسرار اور تحفتہ الانوار وغیرہ جیسی بہت سی مثنویاں ہیں جن کی شہرت و مقبولیت زمان و مکان کی حدود سے نکل کر ساری دنیا میں پھیل چکی ہے ان کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے لہٰذا تفصیلات سے قطع نظر اب ذیل میں ایران کے کچھ مشہور و معروف شعراء اور ان کی اخلاقی شاعری کا ذکر کروں گی۔

ایران کا سب سے اہم اور بڑا شاعر ابوعبداللہ جعفر بن رودکی سمرقندی ہے اس کو پدر شعر فارسی بھی کہا جاتا ہے اس نے اخلاقی شاعری میں کارہائے گرانقدر انجام دیئے ہیں یہ فارسی زبان کا پہلا ایسا شاعر کہا جا سکتا ہے جس کے یہاں اخلاقی موضوعات کو بڑی شدت اور کثرت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے رودکی نے اخلاق اور کردار سازی سے متعلق اپنے اشعار میں ان موضوعات سے متعلق بہترین تفہیم بندی کی ہے، جس میں وہ پیغام دیتا ہے کہ اگر خالق کائنات نے تم کو چار چیزوں یعنی عقل، تندرستی، نیک خوئی اور نیک نامی سے نوازا ہے تو گویا سارے جہاں کی دولت تم کو بخش دی ہے لہٰذا خوش اخلاقی اور سکون سے اپنی زندگی جینے کی کوشش کرو اور کوئی شکوہ و شکایت زبان پر نہ لاؤ کیونکہ اس دنیا میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جو ان چیزوں سے محروم ہیں لیکن پھر بھی خدا کا شکر ادا کرتے ہیں لہٰذا تم کو بھی اس پروردگار عالم کا شکر گزار اور اپنی قسمت پر صابر و شاکر رہنا چاہیے۔

"چہار چیز مر آزادہ را زغم بخرد تن درست و خوی نیک و نام نیک و خرد هر آنکہ ایزدش این هر چہار روزی کرد سزد

شاد زید جاویدان و غم نہ خورد"[۱]

"ایران کے بڑے صوفی شاعروں میں شیخ فرید الدین عطار کا نام سرفہرست ہے اس شاعر بزرگ کی بیشتر شاعری نے انسانی و سماجی اعلیٰ قدروں کی آئینہ دار ہے ان کی شاعری میں خدا شناسی اور خدا پرستی، عقیدہ اور ایمان، دیانت و شرافت، حق پرستی و صداقت گوئی عفو و کرم، ایثار و قربانی، شجاعت و جاں بازی، وفا و جاں نثاری، صبر اور استقلال، راضی بہ رضا رہنے کا حوصلہ، رشتوں کی پاس داری اور انسانیت کا درس، خلوص و محبت وغیرہ جیسے موضوعات پر بے شمار اشعار ملتے ہیں جن کی اہمیت و معنویت آج بھی اسی طرح باقی ہے جیسی کہ ان کے اپنے عہد میں تھی۔ میں ذیل میں ان کے صرف دو شعر نقل کر رہی ہوں جن میں وہ لوگوں کو ایک دوسرے سے بغض و حسد سے دور رہنے کا درس دیتے ہیں کیونکہ حسد ایک ایسی بیماری ہے جو انسان کو کبھی خوشی اور راحت کے دو پل بھی میسر نہیں آنے دیتا حاسد انسان دین و دنیا دونوں جگہ ذلیل و رسوا ہوتا ہے اور خوشی و شادمانی کی دولت اس سے کوسوں دور رہتی ہے"۔

رودکی سمرقندی دکھاوے کی زندگی اور ظاہری عبادت کی بھی سخت مذمت کرتا ہے اس کے نزدیک ایسی عبادتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے جس میں ظاہری طور پر تو لوگ خود کو پرہیزگار اور متقی دکھانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان کے باطن میں نیکی اور بھلائی کی جگہ شر اور فساد اپنا گھر کیے ہوئے ہے ایسا ظاہر دار شخص پورے معاشرے کے لیے ایک بلائے ناگہانی کی طرح ہے لہٰذا انسان کو اس دکھاوے سے خود کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرنا چاہیے تاکہ سکون و راحت کے ساتھ زندگی گزاری جاسکے:

”روی محراب نہادن چہ سود　　　دل بہ بخارا و بتان طراز

ایزد ما وسوسہ عاشقی　　　از تو پذیرد نپذیرد نماز“ ۲

رودکی سمرقندی کے بعد اخلاقیات کے موضوع کو مزید وسعت اور کشادگی بخشنے میں دوسرا سب سے بڑا اور اہم نام ایران کے شاہنامہ گو شاعر فردوسی کا ہے اس شاعر اعظم نے فارسی زبان میں شاہنامہ لکھ کر نہ صرف یہ کہ ایران کی قدیم تاریخ کو زندہ کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے بلکہ پہلوی عقاید، اسلامی تعلیمات اور اخلاقی موضوعات کو یکجا کر کے فارسی ادب کو ایک انفرادی اور عالمگیر شہرت عطا کرنے میں بھی کلیدی کردار ادا کیا ہے ہمارے اس ملی شاعر کے یہاں دس بیس یا سو دو سو نہیں بلکہ ہزاروں ایسے اشعار مل جائینگے جن میں انسان کے اخلاق کو سنوار اور کردار کو مستحکم کرنے کے لیے بہترین تعلیمات پیش کی گئی ہیں ۔ڈاکٹر حسن نے شاہنامہ فردوسی میں پائی جانے والی اخلاقی تعلیمات کے پیش نظر لکھا ہے:

”فردوسی نے داستانوں کی زلفوں میں اخلاق کے موتی پرو دیئے ہیں ۔ان روایتوں میں عبرت بھی ہے، نصیحت بھی اور اخلاق سنوارنے کے طریقے بھی ہیں“ ۳

فردوسی نے شاہنامے میں صرف رزمیہ داستانوں کو ہی پیش نہیں کیا ہے بلکہ ان حکایتوں اور داستانوں کے پس پشت جو اخلاقی نکات پیش کیے ہیں وہ آفاقی شہرت کے حامل ہیں اب ذیل میں اس شاعر بزرگ کے چند مشہور شعر لکھ رہی ہوں جن کو پڑھ کر بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی اخلاقی تعلیمات کسی ایک ملک اور قوم کے لیے نہیں ہیں بلکہ پوری عالمی برادری کے لیے ہیں جن کے ذریعے ایک بہترین معاشرے کی تشکیل میں خاصی مدد مل سکتی ہے اس کے مندرجہ ذیل اشعار دیکھئے جس میں وہ تن آسانی اور کاہلی سے دور رہنے کی صلاح دیتا ہے کیونکہ جب تک انسان محنت و کوشش اختیار نہیں کرتا اس کو زندگی میں کوئی کامیابی و کامرانی حاصل نہیں ہوسکتی ہے لہٰذا کاہلی سے پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ یہ قوموں کی شیروں کی قوت فنا کر کے ان کو مجبور و کمزور بنا دیتی ہے:

”تن آسانی و کاہلی دور کن　　　بکوش و ز رنج تنت سور کن

کہ اید ز تر اسود بی رنج نیست　　　چنان ھم کہ پاسبان گنج نیست“ ۴

ایران کے مشہور و معروف رباعی گو شاعروں میں عمر خیام کا نام سرفہرست ہے انھوں نے اپنی رباعیات میں اخلاقی موضوعات کو بڑے ہی جالب و جاذب انداز میں پیش کیا ہے اور لطیف و دل کش الفاظ میں ہر خاص و عام کو اخلاقیات کا اعلیٰ درس دیا ہے ان کی مندرجہ ذیل رباعی ملاحظہ کیجیے جس میں وہ ان لوگوں کو تنبیہ کرتے ہیں جو دولت و اقتدار کے نشے میں سب کچھ بھول جاتے ہیں اور کمزوروں و ناداروں پر ظلم و ستم کرتے ہیں لیکن انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ ایک دن ایسا آتا ہے جب سارا کروفر اور جاہ و جلال، موت کے ہاتھوں فنا ہو جاتا ہے۔

آن قصر کہ جمشید درا و جام گرفت　　　آہو بچہ کرد و روباہ آرام گرفت

بہرام کہ گور می گرفتی ہمہ عمر　　　دیدی کہ چگونہ گو بہرام گرفت

ایرانی شعری سرمایہ میں اخلاقی نقطۂ نظر سے گرانقدر اضافہ کرنے والے شاعروں میں ایک بڑا نام حکیم سنائی کا بھی لیا جاسکتا ہے ہے، وہ ایک طرف بے نیاز و گوشہ عافیت میں پناہ لینے والے مرد کامل ہیں تو دوسری طرف انسانیت و اخوت کی مضبوط و مستحکم آواز بھی ہیں وہ یک طرف ایک مخلص دوست کی طرح ہم وطنوں کو مطمئن و آسودہ زندگی گزارتے ہوئے دیکھنے کے متمنی ہیں تو وہیں دوسری طرف پوری دنیا کے لوگوں کے کے درمیان انسانیت و اخوت کی حقیقی روح پھونکنے کے خواہش مند بھی ،ان کی مشہور و معروف تصانیف میں حدیقہ سنائی، سیر العباد اور طریق التحقیق وغیرہ کے نام خصوصی اہمیت کے حامل ہیں ان میں انھوں نے عارفانہ مسائل اور اخلاقی مطالب کو بڑے جالب وجاذب انداز میں پیش کیا ہے ،سنایی کی اخلاقی شاعری میں جہاں سماج میں موجود بے شمار برائیوں کی مذمت ملتی ہے وہیں اخلاق کو تباہ کر دینے والی چیز غرور و تکبر کی بھی سخت مذمت کی گئی ہے،ان کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے:

”تو بگفتنا غرۂ شب و روز　　　لیک معلوم تو نگشت امروز

بیش مشنو ز نیک و بدگفتار　　　آنچہ بہ شنیدۂ بکار در آر

دانشت ھست کار بستن تو　　　خنجرت صف شکستن تو

علم با کار سودمند بود　　　علم بی کار پای بند شود“ ۵

اس میں انھوں نے علم و دانش کی اہمیت اور اس کے اصل مقصد کو بیان کیا ہے ان کے نزدیک علم ایک ایسی دولت ہے جس کی مدد سے انسان ناقابل تسخیر چیزوں کو بھی عالم ممکنات میں لے آتا ہے لیکن افسوس کہ بعض لوگ اس کا استعمال صرف رعب جمانے اور اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا علم نہ تو انفرادی طور پر کسی کو کوئی فائدہ پہنچاتا ہے اور نہ ہی اجتماعی طور پر اس سے کوئی منفعت بخش نتائج برآمد ہوتے ہیں بلکہ یہ علم تو خود ہی انسان کے پیروں کی بیڑی بن جاتا ہے لہٰذا کہتے ہیں:

ایران کے بڑے صوفی شاعروں میں شیخ فرید الدین عطار کا نام سرفہرست ہے اس شاعر بزرگ کی بیشتر شاعری نے انسانی وسماجی اعلیٰ قدروں کی آئینہ دار ہے ان کی شاعری میں خداشناسی اور خدا پرستی، عقیدہ اور ایمان، دیانت و شرافت، حق پرستی و صداقت گوئی عفو و کرم، ایثار و قربانی، شجاعت و جاں بازی، وفا و جاں نثاری، صبر اور استقلال، راضی بہ رضا رہنے کا حوصلہ، رشتوں کی پاس داری اور انسانیت کا درس، خلوص و محبت وغیرہ جیسے موضوعات پر بے شمار اشعار ملتے ہیں جن کی اہمیت و معنویت آج بھی اسی طرح باقی ہے جیسی کہ ان کے اپنے عہد میں تھی میں ذیل میں ان کے صرف دو شعر نقل کر رہی ہوں جن میں وہ لوگوں کو ایک دوسرے سے بغض و حسد سے دور رہنے کا درس دیتے ہیں کیونکہ حسد ایک ایسی بیماری ہے جو انسان کو کبھی خوشی اور راحت کے دو پل بھی میسر نہیں آنے دیتا حاسد انسان دین و دنیا دونوں جگہ ذلیل و رسوا ہوتا ہے اور خوشی و شادمانی کی دولت اس سے کوسوں دور رہتی ہے:

چنین گفتہ است کسری بار بدرا　　　کہ بی اندوہ اگر خواہی تو خود را

حسد بیرون کن از خود، شاد گشتی　　　بہ حق راضی شو و آزاد گشتی“ ۶

ایران کے ایک اور بڑے اور معروف شاعر ابو محمد الیاس بن یوسف، حکیم نظامی گنجوی نے بھی اپنی شاعری کے ذریعے لوگوں کو اخلاق و کردار سازی کے متعلق جو مفید اور کارآمد درس دیا ہے اس کی ارزش و افادیت اور سحر آفرینی و تاثیر پذیری آج بھی باقی ہے۔ نظامی کا عقیدہ ہے کہ شاعری کا بنیادی اور اہم مقصد لوگوں کو برائیوں سے دور رکھنے کی کوشش کرنا ہے ضیا الدین بدایونی نے نظامی گنجوی کو ایک بہترین صوفی و اخلاقی شاعر کی حیثیت سے متعارف و روشناس کراتے ہوئے بالکل درست لکھا ہے:

”تصوف اور اخلاق کا چولی دامن کا ساتھ ہے مولانا ایک ممتاز صوفی تھے اس لیے اخلاقی مسائل سے انھیں قدرتی لگاؤ تھا، ان کا تصوف زھد و تقویٰ، توکل و قناعت اور صبر و رضا کا دوسرا نام ہے اور یہ ہی رنگ ان کے کلام میں نمایاں ہے“ ۷

نظامی کی شاعری کا وصف خاص یہ ہے کہ وہ انسان کی روزمرہ کی زندگی کے متعلق سادگی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں ان کی نصیحتیں عام فہم اور سلیس ہیں جن کو ایک عام فہم انسان نہ صرف سمجھ سکتا ہے بلکہ ان پر عمل پیرا ہو کر اپنی زندگی کو بہترین انداز سے گزار سکتا ہے اب ذیل میں ان کی مثنوی مخزن الاسرار کا ایک شعر نقل کر رہی ہوں جس کی مدد سے ان کی سادگی اور پرکاری کو

بہتر انداز میں سمجھا جا سکتا ہے مثلاً وہ کہتے ہیں کہ انسان کو کسی بھی صورت میں ناامید نہیں ہونا چاہیے کیونکہ ہر اندھیرے کے بعد روشنی اور ہر غم کے بعد خوشی یقینی ہے، عصر حاضر کے تناظر میں ان کا یہ شعر مایوسیوں کے گھیرے اندھیروں میں ایک روشنی کی کرن کی طرح محسوس ہوتا ہے:

''درد دل خوش نالہ دل سوز ہست　　　باسیاہی شب گہر روز است''۸

ابن یمین نے بھی اپنے قطعات میں اخلاقی تعلیمات کو پیش کیا ہے ان کے بیشتر قطعات میں دنیا کے تمام انسانوں کی اخلاق سازی اور کردار سازی کا درس دکھائی ملتا ہے وہ اپنے کلام کے ذریعے لوگوں کو اعلیٰ اقدار کو اپنی شخصیت کا حصہ بنا لینے کا درس دیتے ہیں ان کا تمام تر کلام درحقیقت انسانیت کی آواز ہے ان کے مطابق اس کائنات میں کوئی بھی چیز انسان اور انسانیت سے بالاتر نہیں ہے لہٰذا انسان کو بھی اپنی عظمت و مرتبے کو پہچاننا چاہیے ہمارا یہ شاعر بزرگ پوری نوع انسانیت کی خوش حالی اور راحت کا آرزومند ہے یہ ہی وجہ ہے کہ وہ نہایت سلیس اور عام فہم انداز میں اعلیٰ اخلاقی نکات کو پیش کرتا ہے تاکہ ہر خاص و عام ان سے فایدہ اٹھا سکے ابن یمین کا ایک قطعہ ملاحظہ کیجیے:

بگاہ فقر توانگر نمای ہمت باش　　　کہ گرچہ ہیچ نداری بزرگ دارنت
نہ آنکہ باہمہ ہستی شوی خسیس مزاج　　　شوی اگرچہ تو قارون گدا شمارندت

ایران کا سب سے بڑا معلم اخلاق یعنی سعدی شیرازی جس کی عظمت کا اعتراف دنیا کے ہر ملک میں کیا جاتا رہا ہے اس شاعر اعظم کا کمال یہ ہے کہ وہ ہر چھوٹی سے چھوٹی بات میں بھی اخلاقی پہلو نکال لینے کا سلیقہ جانتا ہے، عصر حاضر کا انسان جس چیز کو حاصل کرنے کا سب سے زیادہ آرزومند ہے وہ انسانیت و اخوت، صلح و آشتی، ہم آہنگی و یگانگت، اخلاق و ادب اور امن و امان ہے اور سعدی کے اشعار میں یہ تمام لوازمات اپنی پوری کروفر کے ساتھ نظر آتے ہیں ان کا پیغام کسی مخصوص قوم و ملت کے لیے نہیں بلکہ دنیا کی تمام اقوام کے لیے ہے اور یہ ہی سبب ہے کہ آج صدیاں گزر جانے کے باوجود ان کی جدت و ندرت اسی طرح قائم ہے ذیل میں ان کے کچھ اشعار نقل کیے جا رہے ہیں جو سن ۲۰۰۵ میں نیویارک میں قائم اقوام متحدہ کے داخلی دروازے پر ایک شاندار قالین پر آویزاں کیے گئے ہیں جو اس پوری دنیا کو درس آدمیت دیتے نظر آتے ہیں:

بنی آدم اعضای یکدیگر اند　　　کہ در آفرینش ز یک گوہر اند
چو عضوی بہ درد آورد روزگار　　　دگر عضوھا را نماند قرار
تو کز محنت دیگران بی غمی　　　نشاید کہ نامت نھند آدمی

مولانا جلال الدین رومی ایران کے سب سے بڑے صوفی شاعر شمار کیے جاتے ہیں اس شاعر عظیم کی شاعرانہ عظمت سے کون واقف نہیں ہے اور موجودہ حالات میں تو ان کا کلام سماجی اور روحانی دونوں ہی اعتبار اہمیت کا حامل ہے وہ ایک روحانی استاد کی حیثیت سے اخلاق سازی و کردار سازی کے متعلق جو نغمہ سرائی کرتے ہیں وہ کمیاب نہیں بلکہ نایاب ہے ان کی اخلاقی تعلیمات کا لب لباب یہ ہے کہ اپنے رب سے محبت، عزیزوں سے انسیت، غیروں سے الفت اور تمام مخلوقات جہاں کے لیے اپنے دل میں ہمدردی اور غمگساری کے جذبات رکھیں جائیں۔ مولانا رومی کی عظمت کا اندازہ محض اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کو گزرے آج صدیاں گزر چکی ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے مخلصانہ افکار و جذبات کے سبب آج بھی انھیں وہ ہی عظمت و احترام حاصل ہے جو ان کے اپنے عہد میں دیا جاتا تھا اور صرف شعر و شاعری کے شائقین ہی نہیں بلکہ دنیا میں ہر خاص و عام کی طرف سے ان کی بہترین اخلاقی و صوفیانہ تعلیمات کے سبب لوگ عقیدت مندی کے ساتھ سر جھکاتے ہیں ان کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کیجیے جن مین وہ انسان کو انسان سے محبت اور غم زدہ کی دلجوئی کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور انسانیت و محبت کو سب سے بڑا مذہب قرار دیتے ہیں:

از ھزاراں کعبہ یک دل بہتر است　　　دل بدست آور کہ حج اکبر است
کعبہ بنیاد خلیل آزر است　　　دل گزرگاہ جلیل اکبر است

حافظ شیرازی کو بھی فارسی شاعری کا ایک بڑا اخلاقی شاعر کہا جا سکتا ہے انھوں نے اپنے کلام میں جس خوبصورت اور دل کش انداز میں اس دنیا کے لوگوں کو اچھائی اور بھلائی کی دعوت دی ہے وہ اس قدر عملی اور حقیقت پسندانہ ہے کہ انسان کی نفسیات پر اس کا براہ راست اثر پڑتا ہے آج بھی حافظ کی غزلوں کو گیتوں کی شکل میں گا کر روحانی تربیت کا سامان فراہم کیا جاتا ہے اور اس انسانیت سوز حالات میں ان کا کلام اندھیروں میں اجالے کی طرح محسوس ہوتا ہے ان کا ایک بہت ہی مشہور شعر ملاحظہ کیجیے جس کے ذریعے حافظ نے یہ پیغام پہنچانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کو مشکل سے مشکل وقت میں بھی زندہ دلی اور خندہ پیشانی کو چھوڑنا نہیں چاہیے کیونکہ یہ ہی وہ دولت ہے جو فقیروں کو شہنشاہ بنا دیتا ہے۔

''ہنگام تنگ دستی در عیش کوش و مستی　　　کاین کیمیای ہستی قارون کند گدا را''۹

مذکورہ بالا شاعروں کے علاوہ بھی ہندوستان میں فارسی گو شاعروں کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے اپنے کلام کے ذریعے مخالف ہواؤں میں بھی انسانیت و محبت کے اس پیغام کو جلا بخشنے میں اہم کردار ادا کیا ہے اس کے علاوہ جدید دور میں بھی فارسی زبان کے بے شمار شاعر ہیں جنھوں نے اپنے کلام میں اخلاقی موضوعات کو بڑی شدت اور کثرت کے ساتھ بیان کیا ہے اور آج بھی کر رہے ہیں لیکن وقت کی قلت کے سبب انھیں قلم انداز کیا جا رہا ہے البتہ ایران کے جدید شاعروں کا، اخلاقی شاعری کی طرف بے پناہ رجحان یہ ثابت کرتا ہے کہ انھوں نے اخلاق و کردار سازی کے متعلق اپنے بزرگوں کے بیش قیمت سرمایہ کی نہ صرف حفاظت کی ہے بلکہ مسلسل اس میں اضافہ بھی کر رہے ہیں۔

مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں فارسی شاعری از اول تا آخر عمیق اخلاقی نکات، فکر کن جہات، اور حکمت سے لبریز ہے ایرانی شاعروں نے انسانی زندگی کے ہر پہلو خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، معاشرتی ہو یا تمدنی، سیاسی ہو یا معاشی، قومی ہو یا بیان الاقوامی، سب میں اخلاقیات کو پیش نظر رکھنے کی شعوری کوشش کی ہے ان تمام ایرانی شعراء کا دائرہ، عمل سے لے کر کائنات تک کا احاطہ کیے ہوئے ہے ان عظیم شعراء کا کلام عصر حاضر کے اس لہولہان ہوتے ہوئے معاشرے کی حالت کو سدھارنے میں معاون و مددگار ہو سکتا ہے آج ہمارے چاروں طرف جو نفرت اور تشدد کا ماحول نظر آ رہا ہے ایسے نازک اور مشکل وقت میں فارسی شاعری کا پڑھنا اور اس کو عام کرنا انسانی معاشرے کی بقا اور حفاظت کے لیے بے حد ضروری محسوس ہوتا ہے اس بے پناہ قیمتی ادبی سرمایہ کی مدد سے اگر الگ الگ ملکوں کے شاعروں کے ساتھ ایرانی شاعروں کی آپسی مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور ایرانی شاعری میں موجود اخوت و آشتی، امن و سکون، انس و محبت، ایثار و قربانی، صبر و شکر وغیرہ جیسے صدہا موضوعات کو عام کیا جائے تو یقیناً قوموں کی حالت سدھاری اور سنواری جا سکتی ہے اور ایک بہتر انسانی معاشرے کو وجود میں لانے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے۔

ماخذ

۱۔ تاریخ ادبیات ایران، دکتر رضازادہ شفق، چاپ وانتشارات امیر کبیر تہران، ایران، ۱۳۴۱، صفحہ نمبر ۴۷۔
۲۔ تاریخ ادبیات ایران، دکتر رضازادہ شفق، چاپ وانتشارات امیر کبیر تہران، ایران، ۱۳۴۱، صفحہ نمبر ۴۸
۳۔ مقدمہ تاریخ زبان اردو، ڈاکٹر مسعود حسین خان، آزاد کتاب گھر، نئی دہلی، ۱۹۵۴، صفحہ نمبر ۲۴۱۔
۴۔ شاہنامہ فردوسی جلد ۸، ابوالقاسم، بکوشش سعید حمیدیان، تہران ایران، ۱۳۷۶، صفحہ نمبر ۱۳۱۔
۵۔ حدیقہ سنائی، حکیم سنائی، اہتمام و تصحیح مولوی ابوالحسن، مطبع مولوی نولکشور، سال اشاعت ندارد، صفحہ نمبر ۳۶۱۔
۶۔ الٰہی نامہ، شیخ فرید الدین عطار، مدیر سید محمد میر کمالی خوانساری و آقا حاجی سید اخوان، کتاب فروشی اسلامیہ تہران، خیابان ناصر خسرو، صفحہ نمبر ۲۰۳۔
۷۔ مسالک و منازل، ضیا احمد بدایونی، مکتبہ جامعہ لیمٹیڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۵، صفحہ نمبر ۲۳۸۔
۸۔ نظامی گنجوی، رضیہ اکبر حسن، نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، حیدر آباد، صفحہ نمبر ۷۲۔
۹۔ دیوان حافظ، حافظ شیرازی مترجم مولانا قاضی سجاد حسین، ناشر سب رنگ کتاب گھر، دہلی، صفحہ نمبر ۳۳۔

❑❑❑

ڈاکٹر وسیم احمد راتھر

حاجن، بندی پورہ (جموں کشمیر)

6005931400

امتیاز علی عرشی اور معاصر محققین

بیسویں صدی نے جو نابغہ روزگار اردو زبان و ادب کو سوغات میں دیے ان میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا نام امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کے مخطوط شناس، عربی و فارسی کے دانشور اور عالم دین، ماہر غالبیات، فقید المثال لائبریرین ہی نہیں تھے مترجم، شاعر اور متنی نقاد کی حیثیت سے بھی بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ مولانا عرشی ہندوستان کے ان چند معدودے اشخاص میں سے تھے، جنھوں نے فارسی زبان و اردو ادب سے متعلق اہم تحقیقی کارنامے انجام دیے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں حافظ محمود شیرانی نے اس کی باضابطہ بنیاد ڈالی اور قاضی عبدالودود نے اس پر ایک مضبوط قلعہ کی تعمیر کی۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے ساتھ ساتھ ان کے معاصر محققین نے بھی اردو تحقیق کے میدان کو بہت متاثر کیا انہوں نے کئی اہم تحقیقی خدمات انجام دیے جن سے اردو ادب کے دائرے کو کافی وسعت ملی۔ ان معاصرین میں قاضی عبدالودود، مسعود حسن رضوی ادیب، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اور جناب مالک رام صاحب کا نام سرِفہرست ہیں۔ ذیل میں ان کے تحقیقی خدمات کے حوالے سے جائزہ لیا جائے گا۔

قاضی عبدالودود:

قاضی صاحب اردو تحقیق میں اقتصادیات اور قانون کے راستے سے داخل ہوئے۔ چنانچہ ان کی یہ قانون دانی ان کی تحقیق میں بھی جھلکتی ہے۔ وہ جب تک تمام اسناد اور اس کی چھان بین نہیں کر لیتے اس وقت تک قلم نہیں اٹھاتے۔ اردو میں سائنسی تحقیق کا جو نظام قائم و رائج ہوا، ان میں بعض جزئیات کی معیار بندی میں قاضی صاحب کے رویہ تحقیق کا بھی حصہ ہے۔ تحقیق کے لئے جو اصول انہوں نے واضح کیئے ان میں سے کچھ اس طرح سے ہیں:

۱) تحقیق کسی امر کو اس کی اصل شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے، کوشش کامیاب بھی ہوتی ہے ورنہ کام بھی، کامیابی کبھی جزوی ہوتی ہے کبھی کلّی۔

۲) موضوع تحقیق کے انتخاب میں اپنی صلاحیتوں کا لحاظ ضروری ہے، اور یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ جس سامان کی ضرورت ہوگی۔ اس کی فراہمی لکھنے والے کے لئے ممکن ہے یا نہیں۔

۳) محقق کو خطابت سے احتراز واجب ہے اور استعارہ و تشبیہ کا استعمال صرف توضیح کے لئے کرنا چاہیئے۔ آرائش گفتار کی غرض سے نہیں، اسماء کے ساتھ صفت اسی وقت لانا چاہیئے۔ جب کوئی صفت لکھنے والے کی اصل رائج ظاہر کرتی ہو۔

۴) تحقیق کے لئے مزاجی مناسبت ضروری ہے۔

۵) تحقیق کو قبول عام سے دور کی نسبت ہے۔

قاضی عبدالودود صاحب کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو کی ادبی تحقیق کو سائنسی نقطہ نظر عطا کیا اور اسے مغربی زبانوں کی تحقیق کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ انھوں نے تحقیق میں معروفیت، قطعیت، اور جامعیت پر زور دیا۔ اور اردو کی تین نسلوں کو متاثر کیا ہے اور فنی نسل کی تربیت کی ہے۔ وہ روایت مفروضہ یا گمان پر اپنی تحقیق کی بنیاد نہیں رکھتے بلکہ معتبر دلائل و شواہد کو ضروری خیال کرتے ہیں۔

قاضی صاحب کو چار ادیبوں مصحفیؔ، میرؔ، انشا اور غالبؔ سے بہت دلچسپی تھی۔ مصحفیؔ ان کا مخصوص اور محبوب موضوع ہے۔ مشہور ہے کہ وہ ساری عمر مصحفیؔ پر تحقیق کرتے رہے۔ مصحفیؔ سے متعلق ان کی ایک کتاب، مصحفیؔ اور ان کے اہم معاصرین'' خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ نے ۱۹۹۵ء میں شائع کی۔ یہ کتاب مصحفیؔ سے متعلق دستاویزی حیثیت کی حامل ہے۔ اس لئے کہ اس میں مصحفیؔ کے سال ولادت، مصحفیؔ کا تصور شاعری، غیر مطبوعہ کلام خصوصاً قصائد، مصحفیؔ پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے تبصرے کا جائزہ، ان کے دیوان فارسی اور مجموعہ

> ''دکنیات اور لسانیات دکنیات میں ڈاکٹر زور نے کلیات محمد قلی قطب شاہ کے علاوہ اردو شہ پارے، داستان ادب حیدر آباد اور دکنی ادب کی تاریخ جیسی اہم تصانیف و تالیفات یادگار کے طور پر چھوڑے ہیں۔ اور ان کی کتابوں کی اہمیت ہمیشہ رہے گی۔ ان میں ''اردو شہ پارے'' سب سے اہم ہے۔ ڈاکٹر زور کی یہ کتاب تاریخ ادب میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں اردو ادب کے آغاز سے ولیؔ دکنی کے زمانے تک نثر و نظم کے شہ پاروں کو پیش کیا گیا ہے۔ شعرا اور نثر نگاروں کے حالات کے ساتھ اُن کے نظم و نثر کے بہترین نمونوں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے شائع ہونے سے پہلے اردو دانوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ اردو زبان و ادب میں چار سو سال قبل اتنی اعلیٰ درجے کی نظم و نثر لکھی گئی ہوگی۔ دکنی ادب کی تاریخ کا مطالعہ ''اردو شہ پارے'' کے بغیر مکمل نہیں کیا جا سکتا۔''

اشعار فارسی سے متعلق تحقیقی بحث، عقد ثریا (۱۹۳۴) پر تنقیدی نگاہ، مصحفی اور سودا کا تقابلی مطالعہ، مصحفی اور جرائت کے سلسلے کے بعض امور، سال وفات جرائت، جرائت کی رباعیاں، مصحفی اور انشا سے متعلق بعض اہم امور، مصحفی کا ایک اور فارسی دیوان پر سید احتشام حسین کی بحث پر تنقید وتبصرہ وغیرہ شامل ہیں۔ اس کتاب میں ایک طرح سے مصحفی اور انشا نیز دوسرے وابستہ حضرات کی نگارشات پر تحقیقی مباحث پیش کئے گئے ہیں۔

مصحفی کے علاوہ قاضی صاحب نے جن ادبی شخصیات کو اپنے مطالعہ اور تنقید و تحقیق کا موضوع بنایا ہے ان میں مرزا غالب، محمد حسین آزاد، شاد عظیم آبادی اور بابائے اردو مولوی عبد الحق وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں آزاد، شاد اور عبد الحق پر آپ نے سخت تنقید کی اور ان کی بہت سی باتوں کو بادلائل غلط ثابت کیا۔ ان میں شاد عظیم آبادی سے آپ کچھ زیادہ ہی ناراض نظر آتے ہیں۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ شاد نے اپنے متعلق تعلی سے بہت کام لیا ہے اور اپنی شخصیت کو اُبھارنے اور معاصرین پر اپنی برتری ثابت کرنے کی غیر ضروری کوشش کی۔ قاضی صاحب کو تعلی،، خود بینی، خود داری سے سخت نفرت تھی، لٰہذا وہ ہر ایسے شخص کو ناپسند کرتے تھے جو سستی شہرت اور قبولِ عام حاصل کرنے کے لئے ایسی چیزوں کا سہارا لیتا ہے۔

ان کے تحقیقی تبصرے ان کی علمیت اور کثرت مطالعہ کے گواہ ہیں، ان کے بیشتر مضامین ''معاصر پٹنہ'' سے شائع ہوئے۔ انھوں نے خود بھی ایک رسالہ ''معیار'' انجمن ترقی اردو، بہار کی جانب سے ۱۹۳۶ء میں جاری کیا تھا جو پانچ شمارے نکلنے کے بعد بند ہو گیا۔ قاضی صاحب نے رسالہ ''معیار'' میں علمی طور پر ایک زبردست معیار قائم کرنے کی کوشش کی 'معیار' کے صفحات پر قاضی عبد الودود نے اپنے مضامین سے اپنے لئے اور خود اردو والوں کے لئے تحقیق کا جو معیار متعین کیا، وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ رسالہ ''معیار'' قاضی عبد الودود کی تحقیقی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کا سب سے بڑا مرکز ہے۔

محی الدین قادری زور:

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور حیدر آباد کے اُن ممتاز ترین فرزندوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی قابلیت اور محنت سے جدید حیدر آباد کی ذہنی تعمیر میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ انہوں نے اپنی علمی شغف اور ادبی انہماک سے علمی حلقوں میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ دکنیات کے حوالے سے زور صاحب نے جو تحقیقی خدمات انجام دئے ہیں وہ دکن کے تمام محققین پر بھاری ہیں۔

تحقیق کے میدان میں ڈاکٹر زور کا اہم کارنامہ ''کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ'' کی تدوین اور اس پر ایک مبسوط محققانہ مقدمہ، ان کا شاندار علمی کارنامہ ہے۔ جو ۱۹۴۰ء میں مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد سے شائع ہوا۔ اس میں قطب شاہی سلسلہ سلاطین کے پانچویں بادشاہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے حالات زندگی کے علاوہ اسکے کلام پر تبصرہ ہے۔ یہ کتاب ایک بادشاہ کی سوانح عمری ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں سلطان کے کلام پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے۔

دکنیات اور لسانیات دکنیات میں ڈاکٹر زور نے کلیات محمد قلی قطب شاہ کے علاوہ اردو شہ پارے، داستان ادب حیدر آباد اور دکنی ادب کی تاریخ جیسی اہم تصانیف وتالیفات یادگار کے طور پر چھوڑی ہیں اور ان کی کتابوں کی اہمیت ہمیشہ رہے گی۔ ان میں ''اردو شہ پارے'' سب سے اہم ہے ڈاکٹر زور کی یہ کتاب تاریخ ادب میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں اردو ادب کے آغاز سے ولی دکنی کے زمانے تک نثر و نظم کے شہ پاروں کو پیش کیا گیا ہے۔ شعرا اور نثر نگاروں کے حالات کے ساتھ اُن کے نظم ونثر کے بہترین نمونوں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے شائع ہونے سے پہلے اردو دانوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ اردو زبان و ادب میں چار سو سال قبل اتنی اعلیٰ درجے کی نظم و نثر لکھی گئی ہوگی۔ دکنی ادب کی تاریخ کا مطالعہ ''اردو شہ پارے'' کے بغیر مکمل نہیں کیا جا سکتا۔

مسعود حسن رضوی ادیب:

سید مسعود حسن رضوی ادیب اردو تحقیق و تنقید کے میدان کا ایسا نام ہے کہ ان کا ذکر آتے ہی ان کے ارشادات پر اعتبار کیا جاتا ہے۔ کیونکہ انھوں نے جو کچھ لکھا اور جو کچھ کہا وہ گہری فکر و جستجو کا نتیجہ ہے اس لئے ان کی کتابوں کو برصغیر ہندو پاک میں نہ صرف حرف آخر سمجھا جاتا ہے بلکہ پورے اعتماد کے ساتھ ان کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ مسعود حسن رضوی نے بھرپور علمی و ادبی زندگی گزاری اگر چہ وہ ہمہ وقت تحقیقی کاموں میں مصروف رہتے تھے تاہم کئی علمی و ادبی جماعتوں سے بھی منسلک رہے۔ وہ بعض یونیورسٹیوں کے ایگزیکیٹو کونسلز کے ممبر رہے۔ مسلم اکیڈمی لکھنؤ اور انجمن اردو لکھنؤ کے عہدے دار رہے۔ ان کی خواہش تھی کہ انیس کی صد سالہ تقریبات ان کی زندگی میں ہوں مگر یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ لیکن اس سلسلے میں انھوں نے خاصا کام کیا اور یادگار انیس کمیٹی کے خزانچی رہے۔

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب اردو ادب کے ان سر برآوردہ دانش وروں میں تھے۔ جن کے تحقیقی، ادبی و علمی کارناموں کی بدولت اردو ادب کی تاریخ کو نئی روشنی ملی۔ خاص طور پر اردو کے عام ادبی حلقوں میں تحقیق کے لیے جو سازگار فضا تیار ہوئی اسے اردو تحقیق کی تاریخ میں اُن کا یادگار کارنامہ قرار دیا جائے گا۔

مسعود حسن رضوی ادیب کا سب سے بڑا تحقیقی کارنامہ ''اردو ڈراما اور اسٹیج (۱۹۵۷) ہے۔ اس میں ابتدائی دور کی مفصل تاریخ بیان کی گئی ہے۔ یہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول ''لکھنؤ کا شاہی اسٹیج'' اور حصہ دوم ''لکھنؤ کا عوامی اسٹیج'' ہے۔ پہلے حصے میں ''رادھا کنھیا کا'' قصہ اور دوسرے حصے میں ''اندر سبھا'' یعنی دو ڈراموں کے متن شامل ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے تلاش و تحقیق سے ڈرامے کے متعلق بہت سا مواد جمع کر دیا ہے۔ اس سے ان کی وسعت معلومات اور تعمق نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ ڈرامے کے موضوع پر ایسی کتابیں بہت کم دیکھنے کو ملیں گی۔

رضوی ادیب کا دوسرا کارنامہ میر انیس کی شخصیت و شاعری کے حوالے سے ہے۔ انھوں نے انیس کی شخصیت و شاعری کے بعض پہلوؤں سے پہلی بار بحث کی، مراثی انیس کے مستند ایڈیشن کی تیاری میں حصہ لیا۔ انیس کمیٹی بنائی اور مزار انیس پر ان کے شایان شان کتبہ نصب کرایا۔ اور بڑی دیدہ ریزی اور دیدہ وری سے مراثی انیس کا انتخاب ''روح انیس'' کے نام سے شائع کیا۔ پھر ''رزم نامہ انیس'' کے عنوان سے انیس کی رزم آرائیوں پر مشتمل اشعار کو ایڈیٹ کر کے اردو ایپک میں اضافہ کیا۔

''دیوان فائز'' رضوی صاحب کی تحقیق کی ایک اہم کڑی ہے۔ جس میں انھوں نے فائز کو شمالی ہند کا پہلا شاعر قرار دیا ہے۔ اس کتاب کا پہلا اڈیشن ۱۹۴۹ء میں اور دوسرا نظر ثانی کے بعد ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ یہ رضوی صاحب کی ایک اہم دریافت مانی جاتی ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین میں انھوں نے بڑی کاوش و جستجو سے کام لیا ہے۔ اس پر انھوں نے ایک طویل مقدمہ لکھا ہے۔ اور فائز دہلوی کے حالات و شاعری کے متعلق کافی معلومات جمع کر دی ہیں اور اخیر میں فرہنگ بھی دے دی ہے۔ ''دیوان فائز'' کے لئے پہلے ایڈیشن پر قاضی عبد الودود نے وقیع تبصرہ کیا ہے۔ جو ان کی کتاب ''عیارستان'' ۱۹۵۷ء میں شامل ہے۔ انھوں نے رضوی صاحب کی تلاش و تحقیق کی داد دی ہے۔ لیکن ان سے جو غلطیاں ہوئی ہیں۔ ان کی نشاندہی بھی کی ہے۔ اور بعض نئی اور اہم معلومات پیش کی ہیں۔ قاضی صاحب نے رضوی صاحب کے اس دعوے کی مدلل تردید کی کہ فائز دہلوی شمالی ہند میں اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ رضوی صاحب نے دوسرے ایڈیشن میں قاضی صاحب کے تبصرے سے استفادہ کیا ہے اور فائز کو شمالی ہند میں اردو کا قدیم ترین سنجیدہ شاعر قرار دیا ہے۔

رضوی صاحب کی زبان واضح، سادہ اور رواں ہے۔ لفظوں کا استعمال وہ ضرورت کے مطابق کرتے تھے۔ لیکن اس میں ایک طرح کی شگفتگی بھی ہے۔ کہیں کہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ادائے مفہوم سے زیادہ انھوں نے انداز نگارش کو ملحوظ رکھا ہے۔ بہر حال مسعود حسن رضوی نے اردو تحقیق کی روایت کو برقرار رکھنے اور اسے تقویت پہنچانے میں جو خدمات انجام دی ہیں انھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

❏❏❏

عذرا رضوی

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، خواجہ معین الدین چشتی لینگویج یونیورسٹی، لکھنؤ

8317052091

سید محمود الحسن کی انیس شناسی

(افکارِ انیس کے حوالے سے)

سید محمود الحسن کی تصنیف ''افکارِ انیس'' ۱۴۰ صفحات پر مشتمل ایک مختصر تصنیف ہے مگر اس تصنیف میں مرثیہ گوئی میں میر انیس کے امتیازات کو جس طرح اُجاگر کیا گیا ہے اس میں ادبی تحقیق و تنقید کی شان جھلکتی ہے۔ ساری اُردو دنیا تسلیم کرتی ہے کہ مرثیہ نگاری میں میر انیس کا کوئی جواب نہیں ہے مگر اردو کے بہت سے نقادوں کے ذہن پر ان کا انفرادی ذوق و وجدان اس شدت سے حاوی نظر آتا ہے کہ وہ شعر و ادب کی ہر تخلیق کو محض اپنے ذاتی رجحان کی بنیاد پر پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ ہر صنف پر چہ می گوئیاں کی گئی ہیں۔ جو صنف سب سے زیادہ معتوب ہے وہ مرثیہ ہے جس کی طرف سے ہمیشہ یہ کہہ کر بے اعتنائی برتی گئی کہ ''بگڑا شاعر مرثیہ گو۔ بگڑا گویا مرثیہ خواں'' اول تو مرثیہ کو اس قابل سمجھا ہی نہیں گیا کہ اسے ادبی صنف میں شامل کیا جاتا، دوسرے اسے ایک مخصوص فرقہ کے اعتقادی جذبات کا ترجمان قرار دے کر ادبی حیثیت سے نظر انداز کر دیا گیا۔

سید محمود الحسن کا ذہن ایسے تعصبات سے پاک ہے اس لیے انھوں نے کتاب کے شروع میں ہی جن کتابوں کو انیس کے تفصیلی مطالعے میں مفید بتایا ہے ان میں سر فہرست شبلی نعمانی کی کتاب ''موازنۂ انیس و دبیر'' ہے جس میں مرثیہ کے بعض ادبی پہلوؤں کی طرف متوجہ ضرور کیا لیکن مجموعی طور پر جدید تنقیدی تقاضوں کے تحت اس کی مختلف خصوصیات پر بہت کم توجہ دی گئی۔

سید محمود الحسن کی انیس شناسی کے امتیازات یا ان کی کتاب ''افکارِ انیس'' کی خصوصیات کو پوری طرح سمجھنے کے لیے مرثیہ کی تعریف، اُردو میں مرثیہ نگاری کی ابتداء، دہلی اور لکھنؤ یعنی شمالی ہند میں مرثیہ کی مقبولیت اور میر انیس کے پیش رو اور معاصر مرثیہ نگاروں کا تعارف ذہن میں ہونا ضروری ہے۔ اس لیے مرثیہ کی تعریف اور تاریخ پر پہلے توجہ دی جا رہی ہے۔

مرثیہ عربی میں رثاء سے مشتق ہے جس کے معنی میت کے اوصاف بیان کرنے اور کسی کے غم میں رونے رلانے کے ہیں لیکن اب مرثیہ کی صنف اپنے موضوع کے اعتبار سے اعتقادی اور مذہبی صنف بن گئی ہے۔ اگر چہ اُردو میں شخصی مرثیوں کی روایت بھی مقبول ہے مگر حضرت امام حسینؑ اور آپ کے رفقاء کی شہادت پر سب سے زیادہ مرثیے لکھے گئے اور مرثیہ کا لفظ ذہن میں آتے ہی شہدائے کربلا کے فضائل و مصائب کا تصور ذہن میں اُبھرتا ہے۔

اُردو میں مرثیہ گوئی کا آغاز قطب شاہی دور سے ہوا۔ اشرف کو ان کے مرثیہ ''نوسر ہار'' کی وجہ سے اُردو مرثیہ گوئی کی ابتداء کرنے کا شرف حاصل ہے۔ دکن کے اہم مرثیہ گو شعراء میں مرثیے کے اعلیٰ نمونے محمد قلی قطب شاہ کے یہاں ملتے ہیں اور عادل شاہی دور میں مرزا کے مرثیے میں۔ دکنی مرثیوں میں کربلا کے واقعات کو پُر اثر طریقے سے بیان کرنے اور بین کے جزو پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ مرثیہ کا خاص تعلق واقعات کربلا سے ہے اور واقعات کربلا سے متعلق مرثیہ اگر چہ جذبات نگاری، منظر نگاری، مناظر جنگ اور مناظر قدرت کو پیش کرتا ہے مگر اس کے علاوہ بھی اس میں بہت کچھ ہے۔ مرثیہ گوئی نازک ترین صنف سخن ہے کیونکہ مرثیہ میں تغزل، تخیل، تفکر اور تاثر سب کچھ شامل ہے۔ مرثیہ صرف رثا یعنی گریہ وزاری ہی نہیں، حرکت و بیداری اور خود آگہی بھی ہے۔ لہجہ غزل کا، شکوہ قصیدے کا اور تاثر و تسلسل مثنوی کا، یہ تینوں اجزاء مل کر اس مرثیہ کو ایک ایسا شاہکار بنا دیتے ہیں جس سے روحِ عقیدت بھی لطف اندوز ہوتی ہے اور ذوق سخن کو بھی آسودگی ملتی ہے۔

سید محمود الحسن نے 'افکار انیس' میں یہ ذکر کیا ہے کہ دکن کے بعد جس مرکز ادب نے مرثیہ گوئی کو لامحدود وسعت بخشی وہ لکھنؤ ہے۔ ۱۷۲۴ء میں برہان الملک نواب سعادت خاں نے جب فیض آباد کو مرکز بنا کر اودھ کی خود مختار حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو اس وقت تک فارسی کی لطافت و شگفتگی کو لے کر اردو شاعری کا نیا مزاج تشکیل پا چکا تھا، دوسری طرف ایرانی تہذیب کے زیر اثر یہاں مذہبی

''افکار انیس کا مطالعہ کرنے پر یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ مرثیہ کی ارتقاء میں حکومت وقت کے رجحانات اور اس کے موضوع سے ان کے جذباتی تعلق ہونے سے اس فن کو تقویت ضرور ملی لیکن محض اتنا ہی کافی نہیں تھا، حق و انصاف کے جو کارنامے سامنے آتے تھے، امام حسینؑ کی شخصیت کو نمونہ بنا کر اسلام کے اصولوں کے تحفظ کی جو تبلیغ کی جاتی تھی وہ تاثر پیدا کرنے کے ساتھ ہر اس انسان کے لئے قابل قدر تھا جو زندگی کی اعلیٰ قدروں کو اپنا مسلک بنانا چاہتے تھے۔ اس طرح مرثیہ نے ہر دور میں افراد کی روحانی، ذہنی اور جذباتی تسکین کا سامان فراہم کرنے کے ساتھ ادبی تقاضوں کو جس طرح پورا کیا وہ کسی دوسری صنف سے نہ ہو سکا اور مرثیہ کی ارتقاء میں عوام کے عقائد، سماجی تقاضے، فنی رجحانات اور شاعر کی تخلیقی صلاحیت ان تمام عناصر کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔''

اقدار کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ عہد شجاع الدولہ ہی میں دہلی سے بڑی تعداد میں مہاجرین یہاں آنے لگے تھے جن میں فوجیوں کے علاوہ مختلف علوم کے ماہرین، علماء، شعراء اور ہر طرح کے فنکاروں کو قدر و منزلت حاصل تھی۔ آصف الدولہ نے جب مرکز حکومت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کر کے شعراء اور فنکاروں کو وظائف اعزازات کا سلسلہ شروع کیا تو تقریباً سبھی اہم شعراء وہاں پہونچ گئے، جن میں سراج الدین علی خاں آرزوؔ، ایسے عالم بھی شامل تھے اور سوداؔ، میرؔ، میر حسنؔ، شیر علی افسوسؔ، حیدر بخش حیدریؔ، جرأت، ایسے شعراء بھی۔ ان میں ہر ایک نے مرثیہ گوئی کی طرف توجہ دی۔

لہٰذا 'افکارِ انیس' کا مطالعہ کرنے پر یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ مرثیہ کی ارتقاء میں حکومت وقت کے رجحانات اور اس کے موضوع سے ان کے جذباتی تعلق ہونے سے اس فن کو تقویت ضرور ملی لیکن محض اتنا ہی کافی نہیں تھا، حق و انصاف کے جو کارنامے سامنے آتے تھے، امام حسینؑ کی شخصیت کو نمونہ بنا کر اسلام کے اصولوں کے تحفظ کی جو تبلیغ کی جاتی تھی وہ تاثر پیدا کرنے کے ساتھ ہر اس انسان کے لئے قابل قدر تھا جو زندگی کی اعلیٰ قدروں کو اپنا مسلک بنانا چاہتے تھے۔ اس طرح مرثیہ نے ہر دور میں افراد کی روحانی، ذہنی اور جذباتی تسکین کا سامان فراہم کرنے کے ساتھ ادبی تقاضوں کو جس طرح پورا کیا وہ کسی دوسری صنف سے نہ ہوسکا اور مرثیہ کی ارتقاء میں عوام کے عقائد، سماجی تقاضے، فنی رجحانات اور شاعر کی تخلیقی صلاحیت ان تمام عناصر کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ یہی عناصر تھے جن کے امتزاج سے ہر دور میں مرثیہ گو شعراء کی بڑی تعداد موضوع اور ہیئت ہر حیثیت سے فنی عظمت میں اضافہ کرتی رہی اور ۱۹ویں صدی میں میرؔ انیس اور مرزا دبیرؔ کے ہاتھوں اس صنف کا وہ مرقع تیار ہوگیا جس کے بعد ارتقاء کی راہیں تقریباً بند ہو چکی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مرثیہ نے ہر دور کے ادبی نقادوں کی تکمیل کی ہے۔

واقعہ کربلا کے متعلق مرثیے موضوع کے اعتبار سے مندرجہ ذیل قسموں میں تقسیم کیے گئے ہیں:

۱) مرثیے جو شہیدانِ کربلا کے بارے میں ہیں۔

۲) مرثیے، جن میں جناب مسلم کی شہادت بیان کی گئی ہے۔

۳) مرثیے، جن میں امام حسینؑ کی پیدائش، مدینہ سے سفر، خاندان نبوت کے افراد کی اسیری، دربار دمشق، زندانِ شام اور مدینہ کو واپسی وغیرہ کا بیان ہے۔

۴) مرثیے، جن میں قاصد صغریٰ کا کربلا آنا، مسیّب، زعفر جن اور دوسری روایتیں بیان کی گئی ہیں۔

۵) مرثیے، جو رسول خدا ﷺ، حضرت علیؑ مرتضیٰ، جناب فاطمہ زہراؑ، امام حسینؑ، جناب سکینہؑ، جناب زینبؑ، اور جناب مسلمؑ کے صاحبزادگان کے ذکر میں ہیں۔

مرثیہ کی تعریف و تاریخ ذہن میں رکھتے ہوئے سید محمود الحسن کی 'افکارِ انیس' کی ورق گردانی کرنے سے جو باتیں ذہن میں آتی ہیں وہ یہ ہیں کہ:

۱۔ انھوں نے مرثیہ کی تعریف متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

۲۔ میر انیس کی مرثیہ گوئی کے امتیازات کو اُجاگر کرنے کے ساتھ ان ناقدین سے اختلاف کیا ہے جنھوں نے انیس کی مرثیہ گوئی کو کمتر درجے کی شاعری ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔

۳۔ موازنہ میں چونکہ ایک شاعر کو کمتر اور دوسرے کو برتر ثابت کیے جانے کے بہت امکانات ہوتے ہیں اس لیے انھوں نے موازنہ اور 'موازنہ انیس و دبیر' پر رائے دینے میں احتیاط و توازن کی راہ اختیار کی ہے۔

۴۔ واقعہ کربلا کی جزئیات پر توجہ دی ہے۔

۵۔ انیس کے مرثیوں کے حوالے سے فطرت نگاری اور جذبات نگاری کا مظاہرہ کیا ہے۔

۶۔ میر انیس کی زبان اور زبان میں نکتہ آفرینی کی خصوصیات کو بڑی خوبصورتی سے واضح کیا ہے۔

۷۔ اس کے بعد مرثیہ نگاری میں جدید رجحان کی طرف خصوصی اشارے کیے ہیں:

(۱) مرثیہ میں جیسا کہ پہلے ہی بیان کیا جاچکا ہے کسی بھی مرنے والے کے محاسن بیان کیے جاسکتے ہیں۔ اُردو میں شخصی مرثیوں کی کمی نہیں ہے مگر جب صرف ''مرثیہ'' کہا جاتا ہے تو اس سے مراد حضرات شہدائے کربلا کے فضائل و مصائب کے بیان سے ہوتا ہے۔ مراثی کو انتہائی بلندی میر انیس نے عطا کی ہے۔ اس کی وجہ سے میر انیس نے اپنے مرثیوں میں حضرت امام حسینؑ، ان کے اعزا اور رفقاء سے اس وقت کی حکومت کے نمائندوں کے تصادم کو خیر و شر کی قوتوں کے تصادم کی شکل میں پیش کیا ہے۔ انھیں محاسن نے ان مرثیوں کو مزید پُر اثر بنا دیا ہے۔ سید محمود الحسن نے دونوں باتوں کو بڑی خوبصورتی سے پیش کر دیا ہے:

> ''اُردو مرثیہ کی داغ بیل بعض دوسرے اصنافِ سخن کی طرح دکن میں پڑی، اس کی دوسری منزل دہلی ہے اور ۱۹ویں صدی میں لکھنؤ میں انیس و دبیر کے ہاتھوں یہ اس بلند ترین منزل تک پہنچ گیا جس کے بعد جیسے ارتقاء کی راہیں مسدود ہو کر رہ گئی ہیں اور یہیں سے مرثیہ میں وہ عناصر جذب ہو گئے جس نے شاعری کی ساری خصوصیات شامل کر کے ادب کا لازوال خزانہ بنا دیا۔ چنانچہ شاعری کی عظمت کے جتنے پہلوؤں کا بھی تصور نقادوں نے آج تک کیا ہے وہ سب میر انیس کے مراثی میں موجود ہیں اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اتنی جامع شعری تخلیق اُردو میں کسی دوسری جگہ نظر نہیں آسکتی۔''[۱]

(۲) اچھے اور پُر اثر مرثیہ لکھنے والوں میں کئی شاعروں کے نام لیے جاسکتے ہیں مگر مرثیہ گوئی کو جس عروج پر انیس نے پہنچایا اس میں ان کا کوئی پیش رو ان کا مد مقابل ہوسکتا ہے نہ بعد والوں میں۔ زبان و بیان ہی نہیں دوسری خوبیوں میں بھی میر انیس کو دوسرے مرثیہ نگاروں پر فوقیت حاصل ہے۔ سید محمود الحسن نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ میر انیس کے مرثیوں کی کیا خصوصیات ہیں:

> ''ضمیر کے بعد انھوں نے جب اس صنف کی طرف توجہ دی تو اسے شاعری کا ایسا مرقع بنا دیا جس میں زبان و بیان کی لطافت اور قوت اظہار کے ساتھ واقعیت، افادیت، فکر و شعور اور تاریخی حقائق کی بلندی بھی شامل ہوگئی اور فن کے ایسے لازوال محاسن پیش کر دیے جس کے بعد کسی مزید ترقی کی گنجائش باقی نہ رہی۔''[۲]

اور یہ بھی کہ ان کو یہ خصوصیات پیدا کرنے میں کیوں کر کامیابی حاصل ہوئی؟ اس کا جواب انھوں نے یہ دیا ہے کہ میر انیس میں شاعرانہ قدرت تو تھی ہی جو ان کو قدرت نے ودیعت کی تھی علمی قوت بھی تھی جو انھوں نے اپنی محنت سے حاصل کی تھی۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا:

> ''میر انیس کے اسلوب بیان اور صناعانہ قوت کو ان کی غیر معمولی علمی استعداد اور ذوق مطالعہ سے بھی بڑی مدد ملی، عربی پر گہری نظر ہونے کے علاوہ ان کے مرثیوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان کو آیاتِ قرآنی، احادیث، منطق و فلسفہ اور عروض سے بھی پوری واقفیت تھی۔''[۳]

میر انیس نے تقریباً ۷۲ سال کی عمر پائی اور پوری عمر میں ان کا مطالعہ اور تحصیل علم کا سلسلہ جاری رہا۔ ان کے علم میں بھی اضافہ ہوتا رہا اور مقبولیت میں بھی۔ ان کے عقیدتمندوں میں غرباء اور روٴسا کے ساتھ سخن فہم اور اہل علم بھی شامل تھے۔ انھوں نے عقیدتمندوں کے شدید اصرار پر پٹنہ، بنارس، الہ آباد اور حیدرآباد وغیرہ کے اسفار کیے ورنہ وہ سفر سے گریز کرتے تھے۔ وہ اس وقت سفر کے لیے تیار ہوتے تھے جب یقین ہوجائے کہ جہاں وہ جارہے ہیں وہاں سخنور اور اہل علم ان کی قدر دانی کریں گے۔ ان کی زیادہ شہرت ان کے علم اور شاعرانہ قوت کی وجہ سے ہے۔ میر انیس کو جنھوں نے ایک خاص مسلک میں قید کرنے کی کوشش کی ہے وہ ناکام ہوئے ہیں کیونکہ

جذبۂ عقیدت اور علم کسی دائرے میں قید نہیں کیا جاسکتا۔

(۳) میر انیس کے علم و فضل اور قادر الکلامی کے باوجود ان کے مرثیوں میں بعض ناقدین نے کچھ خامیاں نکالی ہیں یا کہیں اختلاف کیا ہے۔ یہ کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ جس طرح بات کہنے کے کئی پیرایے ہیں اسی طرح بات سمجھنے کے بھی کئی پیرایے ہیں۔ سید محمود الحسن نے ''افکارِ انیس'' لکھنے کے محرکات بیان کرتے ہوئے بعض ناقدین کے طرزِ فکر اور طرزِ استدلال کی شکایت کی ہے:

''مغربی طرزِ انتقاد سے متاثر ہو کر چند نقادوں نے انگریزی شعراء سے موازنہ کرکے میر انیس کو کمتر درجہ کے شاعر کی حیثیت سے پیش کیا ہے چنانچہ اسی بحث کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ ایک گروہ اس بات پر مصر ہے کہ مراثی انیس رزمیہ شاعری کی خصوصیات پر پورے اترتے ہیں اور دوسرے کو اسی شدت سے انکار ہے۔ لیکن میر انیس کے مطالعہ کے سلسلہ میں محض ان محدود خیالات سے قارئین کے ذوق کو تسکین نہیں ملتی۔ انھیں ان کے فن میں دوسرے عناصر کی تلاش بھی رہتی ہے۔ ''افکارِ انیس'' اسی خیال کے پیش نظر لکھی گئی ہے کہ میر انیس کی شخصیت اور ان کے فن کے مختلف پہلو سامنے آجائیں اور ان تمام مباحث کے ساتھ اس دور کی معاشرت اور تہذیبی زندگی کا مطالعہ بھی ہو سکے۔''[۴]

سید محمود الحسن نے ناقدین انیس کی باتوں کا حوالہ دیتے ہوئے انھیں احساس کمتری کا مریض بھی ثابت کرنے کوشش کی ہے اور کلام انیس کی مثالوں سے ان اعتراضات کے بے بنیاد ہونے کے شواہد بھی فراہم کیے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ سبھی اصحاب حسینؑ بھوک و پیاس کے باوجود گھیرابندی کرنے والی فوج کے سامنے دادِ شجاعت دینے کے لیے تیار تھے اس کے باوجود اصحابِ حسینؑ میں ہر شخص کو کلامِ انیس میں اس کے مقام و مرتبے کے مطابق پیش کیا گیا ہے۔ سید محمود الحسن کو شکایت ہے کہ

''اُردو نقادوں کا ایک گروہ احساس کمتری کا اس شدت سے شکار ہے کہ اسے اپنے ادبی و شعری ذخیرہ کی کسی صنف میں کسی حیثیت سے کوئی حسن نظر نہیں آتا ہے اور جس فن میں جتنی زیادہ خوبیاں اور بلندی ہے وہ اسے اتنا ہی کم مایہ اور حقیر سمجھتا ہے۔ چنانچہ مراثی انیس پر بھی اعتراضات کے پہلو تلاش کرکے اس کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ دلچسپ چیز یہ ہے کہ ان میں جو فنی خوبیاں سب سے زیادہ نمایاں ہیں انھیں میں سب سے زیادہ عیب نکالے جانے لگے۔ اس سلسلہ میں ان کی کردار نگاری کو خاص کر نشانہ بنایا گیا۔ کسی نے یہ کہہ کر اپنے تنقیص پسند ذوق کو تسکین دی کہ: ''سیرت نگاری تو اُردو شعراء میں سراسر مفقود ہے۔ انیس کے مراثی میں بھی اس کا وجود نہیں، وہ ہر فرد کی شخصیت کو الگ الگ واضح نہیں کرتے، سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔''[۵]

ان کا خیال ہے کہ مقاصد کے لحاظ سے تمام اصحابِ حسینؓ ایک تھے البتہ عمل میں سب کی شخصیت ایک دوسرے سے مختلف تھی۔

(۴) واقعۂ کربلا صرف اسلامی تاریخ کا نہیں انسانی تاریخ کا المیہ ہے اس واقعہ کو روایات کے فرق کے ساتھ الگ الگ انداز میں بھی بیان کیا گیا ہے مگر یہ تو سچ ہے کہ حضرت حسینؓ کی شہادت ہوئی۔ یہ شہادت جن حالات میں ہوئی وہ انسانی تاریخ کو شرمسار کرتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ قافلۂ حسین کے تمام افراد اپنی انفرادیت کے ساتھ ایک مشترک مقصد کے لیے لڑ رہے تھے۔ میر انیس کربلا اور اصحابِ کربلا کے بارے میں ایک عقیدہ رکھتے تھے۔ روایات کو تلاش کرنا ان کا کام تھا نہ وہ اپنے عقیدے سے انحراف کر سکتے تھے۔ پھر شعری اور فنی پابندیاں بھی ان کے لیے ضروری تھیں اس لیے انھوں نے کچھ ایسے واقعات اس طرح بیان کیے ہیں کہ ان پر اعتراضات کیے گئے ہیں۔ سید احتشام حسین نے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے اور پھر اس کے صحیح ہونے پر اصرار بھی کیا ہے:

''میر انیس واقعۂ کربلا کی تاریخی حیثیت اور ترتیب میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے تھے وہ امام حسینؓ اور ان کے ساتھیوں اور امام حسینؓ کے دشمنوں کے متعلق کچھ عقیدے رکھتے تھے، ان سے سرمو اختلاف کرنا ان کے لیے ناممکن تھا تاریخ اور عقیدہ کی زنجیر میں جکڑے ہونے کے ساتھ ساتھ شاعری کی روایات سے پیدا ہونے والی کچھ فنی پابندیاں بھی تھی (تھیں) جنھیں اچھا شاعر کبھی نظر انداز نہیں کرتا۔ انیس نے اپنے سامعین کی ذہنی صلاحیتوں کا اندازہ کرکے واقعۂ کربلا کے انھیں پہلوؤں پر سب سے زیادہ زور دیا جو باطل کے مقابلہ میں حق کا، شر کے مقابلہ میں خیر کا اور بداخلاقی کے مقابلہ میں اخلاق کا علم بلند کرتے ہیں۔''[۶]

سید محمود الحسن نے ان اعتراضات کو اور زیادہ وسیع تناظر میں دیکھنے اور ان کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کے ذہن میں یہ بات واضح ہے کہ تاریخ اور شاعری کا الگ الگ دائرہ ہے۔ دونوں کو ایک نہیں کہا جاسکتا اور جب دونوں الگ ہیں تو ان کی پیشکش کا انداز بھی جداگانہ ہونا چاہیے۔ انیس نے بھی اپنے عقیدے کو مقدم رکھا ہے مگر ان کے بیان سے جو تاثر قائم ہوتا ہے وہ انسانیت کے لیے بشارت سے کم نہیں ہے۔

اسی طرح انیس کے مرثیوں پر یہ اعتراض بار بار دہرایا گیا ہے کہ اس میں عرب کے واقعات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ وہ اودھ کے واقعات معلوم ہوتے ہیں۔ سید محمود الحسن کی نظر میں اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ

''میر انیس نے اعلیٰ خصوصیات کے تحت صداقت و شجاعت، محبت و اخوت، انسانیت و شرافت اور صبر و تحمل کے جو عناصر شامل کیے ہیں ان کو کسی ایک سرزمین یا ماحول تک محدود کردینا سخت ناانصافی ہوگی۔ اسی طرح اہل حرم کی گریہ و زاری کے سلسلہ میں بھی یہ کہنا غلط ہے کہ یہ خاندان رسالت کے شایان شان نہیں ہے۔ یہاں اس چیز کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ میر انیس نے ہر کردار کو عام انسانی فطرت کی بنیاد پر پیش کیا ہے، چنانچہ کربلا کے ماحول میں اگر عورتوں کا ماتم ان کی آہ و فغاں اور گریہ و زاری نہ دکھائی گئی تو یہ انسانی فطرت کے ساتھ کتنا بڑا ظلم ہوتا اور انیس ایسا باریک بیں فنکار ان فطری تقاضوں کے اظہار سے انحراف نہیں کرسکتا تھا۔''[۷]

یہ بات مختلف انداز سے سید احتشام حسین پہلے ہی کہہ چکے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ میر انیس نے کربلا کے واقعے کو شاعری میں اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری اور سامع اس واقعے کو اپنے سامنے رونما ہوتے محسوس کرتا ہے۔ واقعہ نگاری یا تاریخ نگاری اور شاعری دو الگ الگ فن ہیں دونوں کے تقاضے بھی مختلف ہیں۔ انیس کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے تاریخ یا واقعہ کو اس طرح شاعری میں پیش کیا ہے کہ اس کی اثر پذیری میں اضافہ ہوتا گیا ہے۔

(۵) اگر کوئی شاعر کوئی فرضی واقعہ نظم کرتا ہے تو وہ اس میں اثر پیدا کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے مگر اپنی عقیدت اور تاریخی واقعے کو بیان کرنا اور وہ بھی شعری اور فنی محاسن کا پاس رکھتے ہوئے بہت حساس معاملہ ہے۔ میر انیس نے اس حساس معاملے میں جس طرح انصاف اور اعتدال کا دامن تھامے رکھا ہے وہ ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ سید محمود الحسن نے بہت صحتمند رائے دی ہے کہ:

> ''میر انیس کی واقعہ نگاری کا تعلق تاریخ عالم کی ایک عجیب و غریب جنگ کے کارناموں سے ہے جس میں دو متضاد قوتوں کا تصادم، جسمانی زور آزمائی اور میدانِ جنگ تک محدود نہیں رہا بلکہ یہ مقابلہ قدم قدم پر زندگی کی اعلیٰ قدروں، انسانیت کے اعلیٰ اصولوں اور تہذیب و شائستگی کے عظیم نمائندوں سے بداخلاقی و گمراہی، خودغرضی و ناانصافی کی مغرور جماعت سے ٹکراؤ کی شکل میں نظر آتا ہے اور یہ سارے حقائق تاریخ کے صفحات پر انھیں حیثیتوں سے موجود ہیں ان موضوعات کو شعری پیکر میں ڈھال کر عظمت حاصل کر لینا ایسا کمال تھا جس کا اعتراف کیے بغیر کوئی انصاف پسند نہیں رہ سکتا۔'' ۸

میر انیس کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے واقعہ نگاری کرتے ہوئے یہ بھی بیان کیا ہے کہ کون سا واقعہ کس حال میں پیش آیا ہے۔ ان کی منظر کشی کبھی مرثیہ کے چہرے میں ہے، کبھی رخصت و آمد میں اور کبھی جنگ اور تصادم کے دوران۔ اس سلسلے میں کبھی صبح کا منظر پیش کیا، کبھی شام اور رات کا، اور کبھی دھوپ کی شدت بیان کی ہے۔ انیس کے کلام میں مناظر کو کچھ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ وہ اصل منظر سے بھی زیادہ دلکش یا ہولناک ہو گئے ہیں۔ اس بند میں تو قاری یا سامع کی عجیب کیفیت ہوتی ہے جہاں انیس یہ بیان کرتے ہیں کہ حسینی لشکر کے لوگ نماز پڑھ رہے تھے اور ان پر تیروں کی بوچھار ہو رہی تھی۔ انیس نے اپنے مرثیوں میں ایسی فضاء پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے جس میں انسان کا سارا وجود تاثرات میں کھو جاتا ہے۔ یہی تاثر شاعری کا کمال ہے۔ یہاں یہ دیکھا جاتا ہے کہ شاعر نے جس منظر کو جس انداز میں پیش کیا ہے وہ پڑھنے اور سننے والے پر اثر مرتب کرتا ہے یا نہیں۔

> ''انیس نے واقعاتِ کربلا کی مختلف منزلوں میں فطرت کو اس طرح شریک کر لیا ہے کہ وہ امام حسینؑ اور ان کے اصحاب کے ساتھ ذی روح کی حیثیت سے موجود رہتی ہے اور ان کے جذبات کا اثر مرغ چمن پھول اور پتوں، نسیم سحر اور باد صبا ہر شے پر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ
>
> خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب
>
> حالت یہ تھی کہ
>
> گرمی یہ تھی کی زیست سے دل سب کے سرد تھے
> پتے بھی مثل چہرۂ مدقوق زرد تھے
> گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
> بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر
>
> عرب کی تپتی ہوئی زمین اس عالم میں اصحاب اپنی جانیں قربان کر چکے تھے، اعزاء شوقِ شہادت میں اپنے قدم بڑھاتے رہے اور خود امام حسینؑ کی یہ کیفیت تھی کہ
>
> گرمی میں پیاس تھی کہ پھنکا جاتا تھا جگر
> اُف اُف کبھی کہا کبھی چہرہ پہ لی سپر
> آنکھوں میں ٹیس اٹھی جو پڑی دھوپ پر نظر
> جھپٹے کبھی ادھر کبھی حملہ کیا ادھر
> کثرت عرق کے قطروں کی تھی روئے پاک پر
> موتی برستے جاتے تھے مقتل کی خاک پر'' ۹

کسی واقعہ کو بیان کرتے ہوئے یا کسی منظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے خود شاعر کے کیا جذبات ہیں یا وہ کن کیفیات میں ڈوبا ہوا ہے اس کا اظہار بھی شاعری کا کمال ہے۔ کسی عربی تنقید نگار نے لکھا ہے کہ سب سے اچھی مدح وہ ہوتی ہے جس میں دل کی اعانت شامل ہو۔ انیس نے واقعہ نگاری یا منظر کشی کرتے ہوئے اپنی عقیدت کو مقدم رکھا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان کے دل میں کچھ اور رہے اور وہ زبان سے کچھ اور کہہ رہے ہیں اس لیے ان کی شاعری میں بہت زیادہ اثر ہے۔ میر انیس واقعہ نگار اور مصور تو ہیں ہی جذباتِ انسانی کے ترجمان اور آئینہ دار بھی ہیں۔ انھوں نے وہی نہیں موزوں کیا ہے جو خارج میں آنکھوں سے دیکھا یا کتابوں میں پڑھا یا مجلسوں میں سنا ہے بلکہ انھوں نے ان کیفیات کی بھی تصویر کشی کی ہے جو ان کے وجود میں پنہاں تھیں اور جنھیں وہی بیان کر سکتے تھے۔ سید محمود الحسن نے اس حقیقت کو اچھے لفظوں میں بیان کیا ہے:

> ''میر انیس کا جادو نگار قلم حیات کی آئینہ داری یا جذبات کی ترجمانی میں کسی جگہ قاصر نہیں رہتا۔ انسان کی لاشعوری کیفیات اور نفسیاتی کشمکش کا اظہار ہر فن کار کے بس کی بات نہیں لیکن اس قسم کی دشواریاں بھی ان کی راہ میں حامل نہیں ہو سکیں۔ اس پہلو کو ایک مثال کے ذریعہ آسانی سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ حر جو امام حسینؓ کو راستہ سے گھیر کر کربلا تک لایا تھا، اس کے دل میں ایک ہیجان و انتشار برپا تھا کہ امام حسینؓ پر پڑنے والی مصیبتوں کا ذمہ دار پوری طرح سے وہی ہے۔ دل اس ملامت کے جذبے کے تحت بیقرار تھا اور عقل و حواس کام نہیں دے رہے تھے کہ اس گناہ کی تلافی کیسے ممکن ہے۔ میر انیس اسی کیفیت کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں
>
> کبھی اٹھا کبھی بیٹھا کبھی ٹہلا وہ جری
> گرم آہیں کبھی کیں سرد کبھی آہ بھری
> قلب میں تھی کبھی شورش کبھی دردِ جگری
> سخن یاس کبھی لب پہ کبھی نوحہ گری
> آل احمدؐ کی صدا سن کے تڑپ جاتا تھا
> دم بہ دم خیمہ سے گھبرا کے نکل جاتا تھا
>
> اسی طرح ماں، بیٹے، شوہر، بھائی، آقا اور غلام اور نہ معلوم کتنے رشتوں کے احساسات جگہ جگہ نظر آتے ہیں جن میں فطری تقاضے اور خلوص و بیساختگی کے عناصر پوری شدت سے نمایاں رہتے ہیں۔'' ۱۰

(۶) میر انیس نے جس دور میں مرثیہ گوئی شروع کی اس وقت لکھنؤ کی شعری فضاء پر قافیہ پیمائی، تکلف و تصنع اور لطافت و نزاکت حاوی تھی۔ ہر طرف مرزا دبیر کا طوطی بول رہا تھا۔ میر انیس کو جن کو میر حسن اور میر خلیق کی زبان ورثے میں ملی تھی جلد ہی احساس ہو گیا کہ محض الفاظ کی بندش اور خارجی خوبیوں کے ذریعہ فن کو دوام حاصل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا انھوں نے اپنے دور کے مروجہ طریقوں سے بغاوت کرتے ہوئے اپنی شاعری کے لیے ایسی زبان استعمال کی جو معاشرے کے لیے ناقابل قبول نہ ہو۔ انھوں نے سماعی لذتوں اور صوتی خوبیوں پر تو توجہ دی ہی اس بات کا بھی لحاظ رکھا کہ جذبات کی صحیح ترجمانی ہو:

انیس کے بیان و انداز کو قبولِ عام نصیب ہونے میں بہت دیر لگی۔ انھیں اس کا ملال بھی تھا

سب راست ہیں باتیں سخن لاف نہیں ہے
افسوس مگر خلق میں انصاف نہیں ہے

کچھ اور شعروں میں بھی اس ملال کا اظہار کیا گیا ہے کہ انیس کو وہ قدر و منزلت نصیب نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ لیکن وقت کے ساتھ دنیا نے دیکھا کہ میر انیس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا اور عام طور سے لوگوں نے تسلیم کیا کہ میر انیس کے کلام میں جو سلاست یا زبان و بیان میں جو روانی ہے دوسرے مرثیہ گو اس سے محروم ہیں۔ معلوم نہیں کیوں انیس کی اس تعریف کو بعض لوگوں نے دبیر پر تنقید یا ان کی تخلیق سے تعبیر کر دیا۔ علامہ شبلی اور سید مسعود حسن رضوی وغیرہ نے میر انیس کی زبان اور زبان میں معنی آفرینی کی طرف جو اشارے کیے ہیں ان کا اظہار میر انیس خود کر چکے تھے۔

سید محمود الحسن نے بھی صحیح نکتے کی وضاحت کی ہے:

"میر انیس ایسا باریک بین فنکار اس نکتہ سے بخوبی واقف تھا کہ ان کو جس ماحول میں اپنے فن کی داد حاصل کرنی ہے وہاں معنی آفرینی، صنائع و بدائع روزمرہ محاورات کا استعمال اور لفظی و معنوی محاسن عوام کے ذہن میں ایسا رچ بس گئے تھے کہ ان کے بغیر کامیابی حاصل کرنی ممکن نہ تھی البتہ انھوں نے ناسخ اور دبیر کے اس رنگ سے دور رہنے کی کوشش کی جس سے فن شاعری محض الفاظ کی بازی گری اور صنعتوں کی دقت و پیچیدگی تک محدود ہو کر رہ گیا تھا تاکہ حروف و معنی میں ایسا امتزاج پیدا ہو جائے جس سے بغیر کسی ذہنی پیچیدگی کے تاثر پیدا ہو سکے۔ اس طرح انھوں نے اپنے فن کو محض علماء اور اہلِ زبان تک محدود رکھنے کے بجائے عوام کے ہر طبقے میں مقبولیت حاصل کرنے پر توجہ دی۔"[۱۱]

(۷) میر انیس اور مرزا دبیر اُردو مرثیے کے سب سے اہم نام ہیں۔ دونوں کا طرزِ بیان جداگانہ ہے۔ ان کے انتقال کے بعد مرزا کے صاحبزادے مرزا اوج یا کسی اور کے لیے مرزا دبیر کے رنگِ سخن کو باقی رکھنا ممکن نہیں تھا پھر بھی انھوں نے مرثیے میں جدت پیدا کرنے کی کوشش کی:

کسے غرض ہے پرانے خیال کون سنے
گلوں کی، بلبلوں کی بول چال کون سنے
کہاں مقابل تخئیل نو، خیال کہن

مگر میر انیس کے خاندان یا خاندانی سلسلے کے لوگوں میں میر نفیس، دولھا صاحب، عروج اور پیارے صاحب رشید نے مرثیہ گوئی میں جو روایت چلی آ رہی تھی اس کو باقی رکھنے کی کوشش کی۔

بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں اقبال نے نظم کے مزاج اور اندازِ بیان میں بنیادی تبدیلی کی۔ انھوں نے جا بجا امام حسینؑ کا نام بھی لیا۔ عمومی تاثر بھی یہ پیش کیا کہ

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

وقت بدلتا ہے تو ادب اور شاعری میں بھی مختلف تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ مرثیہ گو شعراء کے سامنے اقبال کی نظمیں تھیں۔ اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جوش ملیح آبادی، جمیل مظہری، آل رضا، تجمل حسین نجم آفندی، ڈاکٹر صفدر آہ، امید فاضلی اور وحید اختر نے اپنے مرثیوں میں جدید رجحانات کو شامل کر کے اس فن کو وسعت بخشی۔ اس فہرست میں کئی ناموں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے مگر جن مرثیہ گو شاعروں کے نام یہاں لکھے گئے ہیں ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سید محمود الحسن نے بہت سچی بات لکھی ہے:

"یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جب کوئی بھی فنکار اپنے کلام میں انسانی تجربات کے مختلف علاقوں اور بنی نوع انسان کی فطرت اور ان کے مسائل کو منظم ہیئت کے قالب میں ڈھال کر آفاقیت کی منزل تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے بعد مدتوں کسی دوسرے کو وہاں تک پہنچنا ممکن نہیں ہوتا۔ چنانچہ اُردو مرثیہ میں آج میر انیس کے بعد تقریباً دو سو سال گزر جانے کے بعد بھی کوئی اس بلندی تک نہ جا سکا۔ البتہ جس طرح ہر فن کے لیے تجربہ اس کی زندگی کی علامت سمجھا جاتا ہے، جس طرح ہر صنف ادب کے ارتقاء کی تاریخ مختلف منازل سے گزرتی ہے، مرثیہ بھی زبان و بیان اور خیالات و تجربات کی راہیں طے کرتا ہوا، شعور اور علم کے دائروں اور عوام کے تقاضوں کے تحت ترقی کی طرف بڑھتا رہا یہاں تک کہ تجدد کے ذوق کے اور نئے فکری عناصر سے مل کر اسے وسعت حاصل ہوتی گئی اور مرثیہ گوئی کی وہ روایت جو میر انیس و مرزا دبیر کی مقبولیت کے سامنے ماند پڑ چکی تھی پھر سے اُبھرنے لگی۔"[۱۲]

"افکارِ انیس" ایک مختصر کتاب ہے مگر اس کتاب میں ایسا بہت کچھ ہے جس سے مرثیہ کی صنف کو نئے انداز سے دیکھنے کی تحریک ملتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی ابتدا رد پر نہیں قبول پر رکھی گئی ہے۔ سید محمود الحسن نے "پیش گفتار" میں ہی واضح کر دیا ہے:

"شبلی نے 'موازنہ انیس و دبیر' لکھ کر مرثیہ کے بعض ادبی پہلوؤں کی طرف متوجہ ضرور کیا لیکن مجموعی طور پر جدید تنقیدی تقاضوں کے تحت اس کی مختلف خصوصیات پر بہت کم توجہ دی۔"[۱۳]

یہ ان کا اپنا نقطۂ نظر ہے اور ضروری نہیں کہ سب کے لیے قابلِ قبول ہو مگر اس میں دبے لفظوں میں سہی شبلی کی انیس شناسی کا اعتراف کیا گیا ہے۔

حوالے

۱۔ سید محمود الحسن، افکارِ انیس، لکھنو ۲۰۰۲ء، ص ۶
۲۔ ص ۳۲ ۳۔ ص ۴۴ ۴۔ ص ۷ ۵۔ ص ۵۸
۶۔ ص ۵۴ ۷۔ ص ۶۹ ۸۔ ص ۸۱ ۹۔ ص ۷-۸۶
۱۰۔ ص ۲-۹۱ ۱۱۔ ص ۶-۹۵ ۱۲۔ ص ۱۰۷ ۱۳۔ ص ۵

❑❑❑

التماس

"ماہنامہ نیا دور" کو ارسال کیے جانے والے مضامین اور تخلیقات کا معیاری ہونا ضروری ہے اور مسودات کمپوز شدہ، مکمل ایڈریس، موبائل نمبر اور تصویر کے ساتھ ہونا لازمی ہے۔ ایسا نہ ہونے کی صورت میں اشاعت ممکن نہیں ہوگی۔

ادارہ--

ڈاکٹر محمد مستمر

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، ذاکر حسین دہلی کالج، دہلی یونیورسٹی۔2

8920860709

رفیع سرسوی کے شعری رویے اور رجحانات

رفیع سرسوی کی پیدائش مراد آباد کے مشہور قصبہ سرسی سادات جسے سرائے شیعہ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، میں ۱۹۵۲ء کو ہوئی تھی اور ۲۳ر نومبر ۲۰۱۹ء کو وہ اس دارِ فانی سے داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ اب یہ قصبہ ضلع سنبھل میں آتا ہے۔ ان کا اصل نام سید رفیع الحسن نقوی تھا مگر اُفق ادب پر رفیع سرسوی کے نام سے درخشاں و تابندہ ہوئے نیز اپنی تابندگی اور علمی شعاعوں سے نہ جانے کتنے تشنگانِ علم و ادب کو سیراب کیا۔ ان کی ابتدائی تعلیم وتربیت مقامی درس گاہوں، اسکولوں سے ہوئی اور بعد ازاں ضلع سطح کی تعلیم گاہوں سے انہوں نے علم و فضل میں کمال حاصل کیا۔ دینی اور دنیوی دونوں علوم و فنون سے موصوف بہرہ ور ہوئے۔ ۱۹۷۴ء میں انھوں نے بارہویں جماعت جوالا پور انٹرمیڈیٹ کالج سے امتیازی نمبروں سے پاس کی۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لئے موانہ ضلع میرٹھ میں بے ٹی سی میں داخلہ لیا۔ اپنی علمی تشنگی کو بجھانے کے لئے بی اے اور ایم اے تک کی ڈگریاں روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی سے حاصل کیں۔ انہوں نے طالبِ علمی کے زمانے سے ہی شعر کہنا شروع کر دیے تھے۔ جب یہ میٹرک میں ہی تھے تو انہوں نے پہلی غزل اپنے لاشعوری نہاں خانوں سے صفحۂ قرطاس پر مرتسم کی تھی۔ انہوں نے شاعری میں شرفِ تلمذ عشرت سرسوی سے حاصل کیا۔ انہوں نے قریب قریب ہر اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ مگر افسوس صد افسوس کہ ان کا زیادہ تر کلام ضائع ہو گیا۔ کچھ احسان فراموش اور طوطا چشم شاگردان کے کلام کے سارق بن گئے اور کچھ کلام ان کی لاپرواہی کے باعث دستِ انقلاب کی نذر ہو گیا۔ چنانچہ آج جو کچھ کلام دستیاب ہے وہ تو بھلا ہو جو نیک خصلت اور دیانت دار و امانت دار شاگرد کے ہاتھوں کچھ کلام لگ گیا ورنہ خدا جانے اس کا بھی کیا حشر ہوتا۔ میری مراد محترم مرزا مجاور حسین ساکھنی سے ہے جو واقعی ایک لائق، ہونہار، باصلاحیت اور اصل میں ادب نواز، سخن پرست، ذی فہم اور قلم کے دھنی ہیں۔

وہ لوگ بے حد خوش قسمت ہوتے ہیں جن کے حصے میں اچھے شاگرد آتے ہیں۔ غالب کی مقبولیت اور عظمت کا راز اسی بات میں مضمر ہے کہ ان کے حصے میں خواجہ الطاف حسین حالی جیسا شاگرد آیا حالانکہ شاگرد تو ان کے اور بھی تھے مگر جس خلوص اور محبت کے ساتھ سب سے پہلے حالیؔ نے غالبؔ کے حوالے سے کام کیا وہ کسی نے اور نے نہیں کیا۔ درحقیقت انہوں نے غالب اور شخصیتِ غالب کو حیاتِ جاوید بنا دیا۔ اس سلسلے میں اگر یہاں یہ بات عرض کروں کہ رفیع سرسوی کو مرزا مجاور حسین جیسا لائق و فائق شاگرد میسر ہوا ہے تو اس میں کسی طرح کا غلو نہ ہوگا۔ رفیع سرسوی اور مرزا مجاور حسین دونوں کی شخصیت ایک مرکز پر آ کر اس طرح جمع ہو جاتی ہیں کہ گویا دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہوں۔ جب بھی رفیع سرسوی کی بازیافت پر بات کی جائے گی تو مجاور حسین کے بغیر تحقیق کا باب مکمل نہیں ہوگا۔

مرزا مجاور حسین اگر چاہتے تو رفیع سرسوی کے غیر مطبوعہ کلام کو اپنی نام سے بھی چھپوا سکتے تھے۔ کیونکہ ویسے بھی رفیع سرسوی کے کلام کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ یہ مرزا مجاور حسین کی تگ و تاز اور کاوشوں کا ہی نتیجہ ہے کہ آج جو کچھ کلام چھپ کر ہمارے ہاتھوں میں ہے، اس کا سہرا مرزا مجاور حسین کے ہی سر بندھتا ہے۔ رفیع سرسوی خلوت گزیں ہو کر محفلِ شعر و سخن کے مزے لیتے رہے اور بڑی زود نویسی کے ساتھ شاعری کے گیسو سنوارتے رہے۔ لیکن ستم ظریفی یہی رہی کہ اپنا کلام محفوظ نہ کر سکے۔ بعد مرنے کے جن جن لوگوں کے ہاتھوں جو کلام لگا انہوں نے اس پر ڈاکہ ڈال لیا اور اپنے نام کی مہر لگا دی۔ لیکن مرزا مجاور حسین کی ایمانداری، دیانت داری اور للہیت دیکھیے کہ ان کے ضمیر نے یہ گوارا نہ کیا۔ اگر وہ چاہتے تو یہ تمام کلام اپنے نام درج کرا سکتے تھے۔ مگر یہ ان کی اعلیٰ ظرفی اور فنکارانہ صلاحیتوں کا ثبوت ہے کہ انہوں نے اپنے استاد کے کلام کو نہ صرف تلاش کیا بلکہ تمام تر کوششوں کے ساتھ اسے اشاعت کے مرحلے تک بھی پہنچایا۔ آج اگر ہم رفیع سرسوی جیسے عظیم المرتبت فنکار کے کلام کا مطالعہ اور ان کے نظریات و خیالات سے آگاہی حاصل کر رہے ہیں تو اس میں صد فیصد رول مرزا مجاور حسین صاحب کا ہے۔ میں ان کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ انہیں تا دیر سلامت اور صحت یاب رکھے تاکہ وہ اسی طریقے سے بے لوث ہو کر

> ”رفیع سرسوی کی غزلوں میں قاری کو قدم قدم پر اور جگہ جگہ فسطائی زمانے کی گونج، افرا تفری، بدنظمی اور غیر انتظامی امور دکھائی دیں گے۔ سب سے خاص بات ان کے کلام کی یہ ہے کہ وہ اس اعلانِ جنگ کو اتنی خوبصورتی اور استعاراتی عمل کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ ان کا کلام ترقی پسند شاعروں کی طرح نعرہ بازی نہیں بنتا بلکہ ان کا یہ اعلانِ جنگ اور مہم خالص ادبی رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو رفیع سرسوی کا کلام سماجیات اور سیاسیات کا شعبہ ہے۔ ایسا کون سا نقطہ، زاویہ، پہلو اور مسئلہ نہیں کہ جس کو انہوں نے اپنی غزلوں کا حصہ نہ بنایا ہو۔ پورا سماجی علوم اور سیاسی علوم کا مطالعہ ان کے کلام کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے اور اسی سیاسی اور سماجی علوم کے درمیان وہ نفسیاتی کیفیتیں بھی جنم لیتی ہیں جن کا تعلق افلاس، بھکمری، بے بسی، لاچاری، غربت، مفلسی، بدحالی، مفلوک الحالی، دہشت گردی، وحشت و خوف، بیابانی و ویرانگی، مبروص ہوتے چہرے اور مفلوج ہوتے ذہن اور خوف و دہشت کے باعث مرتعش ہوتے اجسام سے ہے۔“

اردو شعر و ادب کی خدمت کرتے رہیں اور یہ شیریں پودا جو اب تناور درخت بن چکا ہے یوں ہی سرسبز و شاداب ہوتا رہے۔اب میں اپنے مقصد کی طرف مراجعت کرتا ہوں یعنی رفیع سرسوی کے کلام و فن اور افکار و اذکار پر کچھ باتیں کرنے کی جسارت کروں گا۔

اس سے قبل کہ میں رفیع سرسوی کے کلام میں مخفی و پنہاں موضوعات،نظریات اور خیالات کا احاطہ کروں راقم الحروف کے لیے یہ لا بدی امر ہے کہ ان کی شاعری میں پائے جانے والی لفظیات، زبان و بیان، اسلوب اور طرزِ تحریر پر گفتگو کی جائے تاکہ قارئین کو اندازہ ہو سکے کہ رفیع سرسوی کا ڈکشن کن اوصاف کا حامل ہے۔کیونکہ جہاں تک راقم الحروف کا ماننا ہے تو اچھے موضوعات،نظریات اور خیالات تبھی جنم لیتے ہیں جب فنکار کے پاس ذخیرۂ الفاظ،لفظوں کا خزانہ یا یوں کہہ لیجیے مخزنِ الفاظ سے اس کا گہرا رشتہ ہوتا ہے کیونکہ اچھا خیال اور نظریہ بھی ڈکشن کا ہی محتاج ہوتا ہے اور ڈکشن کے بغیر پروازِ تخیل بھی ناقص ہے۔ چنانچہ الفاظ ہماری زندگی میں ٹربائن کی حیثیت رکھتے ہیں۔جس طرح بغیر ٹربائن کے بجلی تیار نہیں کی جا سکتی، اسی طرح الفاظ کے بغیر انسان اور انسان کی زندگی بلکہ پوری کائنات بے ہنگم، بے رنگ اور بے جان ہے۔ہم کسی بھی موضوع، مسئلہ یا علم کے میدان میں گھوڑے دوڑانا چاہیں بغیر الفاظ کے ہم کچھ نہیں کر سکتے اور پھر شاعری تو ہے ہی احساسات و جذبات و خیالات و نظریات کا نام۔ چنانچہ اپنی بات کو پر اثر اور معنی آفرینی بنانے کے لیے الفاظ کی دروبست،نشیب و فراز، مدوجزر، پستی و بلندی اور اس کے سُر تال سے واقف ہونا ضروری ہے۔لہٰذا جب ہم رفیع سرسوی کی کائناتِ غزل کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ احساس بخوبی ہو جاتا ہے کہ الفاظ کے معاملے میں انہیں گہرا شعور و بصیرت ہے۔وہ اپنی غزلوں میں ایسے نادر، انوکھے، البیلے، پر اثر اور بامحاورے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں کہ شاعری نگار خانہ معلوم ہوتی ہے۔اگرچہ ان کے یہاں الفاظ کے استعمال کا ڈھنگ اور اس کی برتنے کا طریقہ زیادہ تر فارسی آمیز نہیں ہے۔تاہم انہوں نے الفاظ کے استنباطی عمل اور انتخابِ الفاظ میں بڑی چابک دستی اور فنکارانہ ہوش مندی کے ساتھ کام لیا ہے۔ان کی شاعری کی زبان کو خالص اردو، شستہ، بامحاورہ اور نفیس اردو سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔کسی زمانے میں آرزو لکھنوی نے بھی اپنی شاعری اور غزلوں کے لیے اسی طرح کی اردو زبان کا استعمال کیا تھا۔رفیع سرسوی کا امتیاز و اختصاص بھی یہی ہے کہ وہ گنجلک، ادق، ثقیل اور مشکل الفاظ سے گریز کرتے ہوئے غزل کی بساط تیار کرتے ہیں۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ کبھی کبھی وزن اور بحر کی مجبوری کی وجہ سے غیر مانوس اور مشکل الفاظ کا استعمال کر لیتے ہیں۔ایسا کرنا شاعر کا قصداً عمل نہیں ہوتا بلکہ یہ اس کی مجبوری ہوتی ہے۔ان کچھ خامیوں سے قطع نظر اگر رفیع سرسوی کی شاعری کی زبان پر بات کریں تو کل ملا کر ان کی شاعری کی زبان، وہ زبان ہے جو ہر خاص و عام کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے اور قاری کو باندھے رکھنے کی طاقت رکھتی ہے۔موصوف کا اندازِ تخاطب سادہ، سلیس، رواں دواں، شستہ و شائستہ اور شگفتگی کا متحمل ہے۔ان کی غزلیں موسیقی میں ڈھلی ڈھلائی اور سُر تال میں بندھی ہوئی نظر آتی ہیں۔غزلوں کا رنگ و آہنگ قدم قدم پر قاری کو ایک نئے جذبے، اثر اور معنی سے شرابور کراتا ہے۔

جہاں تک ان کی غزلوں کی ردیفوں اور قافیوں کا تعلق ہے تو وہ اپنی غزلوں کے لیے ایسی زمین تیار کرتے ہیں جو معاصر شعراء سے الگ نہج کی مرتکب ہوتی ہیں۔ان کی غزلوں کی زمین میں انفرادیت بھی ہوتی ہے اور جدت و ندرت بھی پنہاں رہتی ہے۔انفرادیت کا لفظ راقم نے یوں ہی استعمال نہیں کیا ہے بلکہ جب قاری ان کی غزلوں کا مطالعہ کرے گا تو یہ فنی اختصاص خود محسوس کرے گا کہ واقعی رفیع سرسوی نے اپنی غزلوں کے لیے جن ردیفوں اور قافیوں کا استعمال کیا ہے اس سے غزل کی ایک ایسی زمین تیار ہوئی ہے جو کچھ الگ ہٹ کر اپنے ہم عصروں سے نئے پن کا احساس کراتی ہے۔ یہ نیا پن ایسا ہی ہے جیسے کہ ایک مالی پلانٹ بریڈنگ کے تحت پیڑ کی ایک جڑ پر مختلف قلمیں چڑھا کر کچھ الگ اور نئے ڈھنگ کے پودے اُگانا چاہتا ہے۔ رفیع سرسوی کا معاملہ بھی بالکل اُسی مالی کی طرح ہی ہے۔انہوں نے بھی غزلوں کی زمین تیار کرنے میں کچھ اسی طرح کی قلم کاری اور تخم ریزی کی ہے۔یہی وجہ ہے کہ رفیع سرسوی کی شاعری میں نئے رنگ، نئے آہنگ اور نئی دھنیں پیدا ہو گئی ہیں جو چنگ و رباب کے شعبے میں نئی موسیقی کو جنم دیتی ہیں۔ان کی مجموعے میں کچھ غزلیں ایسی بھی ہیں جنہیں مسلسل غزل کے زمرے میں میں شامل کیا جا سکتا ہے یا پھر نظم کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ان غزلوں کی ربطگی، تسلسل اور ایک شعر کی دوسرے شعر کی مناسبت کی وجہ سے صنفِ نظم وجود میں آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ان نظموں کے عنوانات کچھ اس طرح طے کیے جا سکتے ہیں۔مثلاً چیخ، قلم اور کاغذ، رات، چاندنی، تخت و تاج، دسمبر کی، دسمبر، وغیرہ اسی نوع کی غزلیں ہیں کہ جن کی ردیفوں اور بیانِ تسلسل نے ان میں نظم کی چاشنی رنگینی اور رمزیت بھر دی ہے۔ ان غزلوں کو جب قاری پڑھتا ہے تو غزل کے ذائقے اور اس کی مٹھاس سے تو لطف اندوز ہوتا ہی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ نظم کی وادی میں بھی سیر کرنے لگتا ہے۔ یہاں بطور نمونہ ان غزلوں کے چنندہ چنندہ شعر پیش کیے جاتے ہیں جن کو رفیع سرسوی نے اپنی فطانت و ذہانت سے انہیں لباسِ نظم پہنا دیا ہے:

وہ دمِ ہجرت عزیز و اقربا ہمسر کی چیخ
گونجتی ہی آج بھی کانوں میں بام و در کی چیخ
خون سے لبریز مقتل بے کفن لاشوں کے ڈھیر
وہ شب شامِ غریباں بے کس و بے پر کی چیخ
(نظم چیخ)

ان کے گھر کے خس و خاشاک قلم اور کاغذ
میری دولت میرے املاک قلم اور کاغذ
جب سماجوں کی نکلتی ہیں برہنہ فکریں
ان کو دے دیتے ہیں پوشاک قلم اور کاغذ
(قلم اور کاغذ)

جگنوؤں سے جھلک رہی ہے رات
دھیرے دھیرے سرک رہی ہے رات
کیا قریب آ گیا ہے وقتِ اذاں
آنکھ میری جھپک رہی ہے رات
(رات)

شبنم میں رات بھر تو نہاتی ہے چاندنی
پھر کس سے جانے ملنے کو جاتی ہے چاندنی
ڈوبے ہوئے ہیں اپنے تکبر میں جو چراغ
ان کا غرور روز مٹاتی ہے چاندنی
(چاندنی)

یہ الگ رکھتے ہیں منہ میں زباں تخت و تاج
پھر بھی کر دیتے ہیں سب حال بیاں تخت و تاج
ان کی تاریخ جو پڑھتا ہوں تو گھن آتی ہے
خوں خرابے کی علامت ہے میاں تخت و تاج
(تخت و تاج)

امیرانِ وطن کو تھی بہت چاہت دسمبر کی
گلی کوچوں میں چرچے اور تھی شہرت دسمبر کی

تکبر آنے والا تھا ہواؤں میں ابھی اس کی
الٹ دی کاتبِ تقدیر نے قسمت دسمبر کی
(دسمبر کی)

لگ جائے گی بے کس کی کوئی ہائے دسمبر
اچھا ہے دبے پاؤں چلا جائے دسمبر
بوسیدہ لباسوں میں بدن کانپ رہے ہیں
افلاس کے معروم پہ ترس کھائے دسمبر
(دسمبر)

قاری جب ان غزلوں کا مطالعہ کرے گا اور غزل کے تمام اشعار سے رو برو ہوگا تو یقیناً اس کو میرے جملوں پر ایمان لانا پڑے گا کہ درحقیقت رفیع سرسوی نے اپنے فن کی چاشنی ان غزلوں میں کچھ اس نوعیت سے بھر دی ہے کہ یہ غزلیں خود بخود نظم کے سانچے میں ڈھل گئی ہیں یا ڈھلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان نظموں کا بنیادی وصف وہی ہے جو رفیع سرسوی کی انفرادیت بھی ہے اور جدت بھی ہے یعنی کہ انہوں نے ان نظموں میں بھی سماجی، سیاسی اور تاریخی مسائل کو بہت خوبصورتی کے ساتھ ضم کیا ہے۔ مگر 'چاندنی' نظم میں ان کا یہ ارتکازی وصف نظر نہیں آتا بلکہ وہ مکمل طور پر رومانی و جمالیاتی فضا اور ماحول کا حصہ بن جاتے ہیں جس میں تغزل اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتا ہے۔ لہٰذا نظموں کو پڑھتے وقت ہمیں رومانی شاعروں مثلاً اختر شیرانی، مجاز، جوش، ہندی شاعروں سمترا نند پنت، جے شنکر پرساد، مہادیوی ورما اور سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا اور انگریزی شاعروں پی بی شیلے، کیٹس اور ورڈز ورتھ وغیرہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ 'چاندنی' نظم واقعی رفیع سرسوی کی ذہنی بزم آرائیوں کا نتیجہ ہے کیونکہ ایسا بہت ہی مشکل ہوتا ہے کہ انسان کائنات کے حسن سے چشم پوشی کر لے۔ کہیں نہ کہیں بھلے ہی چاہے وہ انقلابی یا احتجاجی فطرت کا ہی مالک کیوں نہ ہو، کائنات کا حسن، اس کے دماغی خلیوں اور لاشعور کی پناہ گاہوں میں پیوست رہتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ یہ رومانی وصف صرف 'چاندنی' نظم میں ہی جلوہ گر ہوا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے غزلیہ کلام میں بھی یہ وصف دکھائی دیتا ہے مگر یہ وصف رفیع سرسوی کے انقلابی لب و لہجے اور احتجاجی تخاطب کے تحت مزید نمایاں اور آشکار نہیں ہو پاتا۔

رفیع سرسوی کی غزلوں کے موضوعات کا جہاں تک تعلق ہے تو وہ نہ خالص رومانی شاعر ہیں نہ محض جمالیاتی بلکہ ان کا مطمحِ نظر اور ارتکاز مسائل پر رہتا ہے۔ خواہ وہ مسائل سماجی ہوں، معاشرتی ہوں، سیاسی ہوں، تاریخی ہوں معاشی ہوں، اقتصادی ہوں یا پھر یا مذہبی ہوں یا مسلکی۔ ان مسائل کے تناظر اور روشنی میں اگر ان کو مسئول شاعر کے طور پر تسلیم کر لیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ ایسا نہیں ہے کہ مسائل سے ہٹ کر انہوں نے غزل کی نازکی اور غمازی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان مسائل کے بین السطور میں قاری غزل کے لوازمات والتزامات نیز تقاضوں سے بھی ہم آہنگی اور آگاہی حاصل کرتا ہے۔ رفیع سرسوی کا کمال اور فنی اختصاص یہی ہے کہ وہ اپنی غزلوں میں کسی بھی طرح کے مسائل و موضوعات کو بیان کرتے ہوں مگر متن کے بطن میں غزل کی شوخی وطنازی اور نزاکت و نفاست نیز نازکی اور تازگی اور شبنمی کیفیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں قاری کو غزل کی خوش فکری، شمیمیت، رعنائیت اور غنائیت کا قدم قدم پر بخوبی احساس ہوتا ہے۔ پڑھنے والے کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ کسی شاعر کی نعرے بازی سے رو برو یا ہم کلام ہو رہا ہے بلکہ اسے غزل کی بساط اور بنیادیں مزید مضبوط ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ رفیع سرسوی نے غزل کو ہر طرح کے مسائل سے اس طرح پیوست اور ہم آہنگ کر دیا ہے کہ دامنِ غزل کی کشادگی اور وسعت میں گہری معنویت پیدا ہو گئی ہے۔

کسی بھی فنکار کے فن کی تعبیر و تفہیم کو جاننے کے لیے اس کے عہد، اس کا ماحول، اس کا سماجی پس منظر اور دیگر معاشرتی سروکاروں کو جاننا بھی لابدی امر ہے۔ جب ہم فنکار کی ذاتیات اور اس کے خاندانی پس منظر کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو فن پاروں کو مزید سمجھنے کے لیے آسانی ہو جاتی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ نفسیاتی گرہیں بھی کھل کر سامنے آتی ہیں جن کا تعلق کہیں نہ کہیں فن پاروں سے ہوتا ہے۔ رفیع سرسوی نے جس ماحول اور معاشرے میں آنکھیں وا کیں اور جس طرح کی زندگی انہوں نے گزاری وہ تمام تر کوائف و حوادث ان کی شاعری میں حلول ہو گئے ہیں۔ ان کی شاعری کو پڑھنے پر اس بات کا بھی انکشاف ہو جاتا ہے کہ ان کا تعلق کس عقیدے اور مسلک سے رہا کیونکہ وہ تمام عقائد اور مسلکی رجحانات ان کی شاعری میں قدم قدم پر دکھائی دیتے ہیں اور یہ فطری امر بھی ہے اور نفسیاتی پہلو بھی کہ فنکار جس خطے، علاقے اور عقیدے سے وابستہ ہوتا ہے وہ عناصر اس کی شاعری میں نہ چاہتے ہوئے بھی خود بخود بڑی شان و شوکت، طمطراق اور آن بان کے ساتھ شبستانِ فن اور قصرِ شاعری میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کسی بھی فنکار پر یہ الزام عائد کرنا کہ اس نے اپنے عقیدے اور مسلک کی نمائندگی کی ہے، سرے سے غلط ہے۔ اگر وہ اپنے عقائد اور مسلکی رجحانات کی نمائندگی نہیں کرے گا تو پھر کیا کرے گا؟ درحقیقت سچا فنکار وہی ہوتا ہے جو اپنے عہد، اپنی تاریخ، اپنی تہذیب، اپنی ثقافت اور اپنے اخلاقیات اور تعلیمات کو اپنے فن کے سانچے میں خوبصورتی کے ساتھ پیش کر دے اور یہ کام بہ حسن و خوبی رفیع سرسوی نے انجام دیا ہے۔ اسی لیے رفیع سرسوی کی غزلیں فقط تفنن طبع کا سامان نہیں ہیں بلکہ ان کی غزلوں میں اپنے عہد کی تاریخ کے ساتھ ساتھ وہ عناصر وابستہ ہیں جو ماضی کی جڑوں سے اپنا رشتہ استوار کرتے ہیں۔ چنانچہ جب فنکار کا فن ماضی کی جڑوں سے رشتہ استوار کرنے میں کامیاب نظر آئے تو اس کے فن کی تعبیر و تفہیم میں ایک نقاد کو مقتضائے فن کے تحت مزید مطالعے کی ضرورت پیش آتی ہے کیونکہ حال سے ہوتے ہوئے ماضی کی جڑوں تک پہنچنا ہر صاحب نقد کے بس کا روگ نہیں ہے۔ یہی وہ فنی اسباب و علل ہیں کہ جس سے رفیع سرسوی کے فن کا دائرہ سکڑتا نہیں بلکہ وہ مزید پھیلتا ہوا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ ان کی غزلوں میں پائے جانے والی فنی خوبیاں 'جزٗ' سے 'کل' کا سفر طے کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ لیکن اس سفر میں ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ قاری اسے آسانی سے عبور کر لیتا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ رفیع سرسوی نے اپنے خیالات و نظریات کی ترجمانی کے لیے کہیں بھی ایہام یا ابہام سے کام نہیں لیا ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنا پیغام قاری تک پہنچانے کے لیے براہِ راست مخاطب نہیں ہوتے بلکہ اس کے لیے وہ کنائے اور استعاروں سے کام لیتے ہیں۔ جس میں ان کی فنکارانہ صلاحیت اور ذہانت کی داد دینی پڑتی ہے کیونکہ کنایتی عمل بظاہر آسان لگتا ہے مگر کنایتی رویوں کو اپناتے ہوئے اپنی بات کو آسانی کے ساتھ قاری تک پہنچانا اتنا سہل کام نہیں ہے۔ اس ضمن میں کچھ شعر پیش کیے جاتے ہیں:

بنا دیا جسے دہشت گروں نے اب مقتل
سنا ہے خطہ کبھی یہ پیغمبروں کا تھا
کبھی نظر سے کبھی انگلیوں سے توڑ دیے
سنا ہے وہ تو کھلاڑی ہی خیبروں کا تھا
شجاعتوں کے قبیلے کا شخص ہے کوئی
لہو لہان ہے، زخمی ہے، پر اُداس نہیں
وہاں بھی پیاس کو ہم نے حیات لکھا ہے
جہاں پہ ٹھنڈی ہوائیں بھی آس پاس نہیں
احساس انہیں ہوتا کہاں میرے سفر کا
تاریخ اگر آبلہ پا تک نہیں آتی

رفیع سرسوی کی غزلوں کے تناظر میں اگر یہ بات کہہ دی جائے کہ ان کی غزلیں اپنے عہد کی تاریخ اور منظر نامہ ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اگر اکیسویں صدی اور اکیسویں صدی سے قبل بیسویں دہائی کے آخری عشروں کو تلاش کرنا ہے تو رفیع سرسوی کی غزلوں کا مطالعہ کیجئے۔ تقریباً چالیس برسوں

میں جو کچھ وقوع پذیر ہوا اور جو حالات و حادثات پیش آئے خواہ وہ سیاسی رہے ہوں، سماجی رہے ہوں، معاشی رہے ہوں یا اقتصادی یا اور دوسرے طرح کے مسائل رہے ہوں۔ ان تمام کا عکس قاری، رفیع سرسوی کی غزلوں میں تلاش کرسکتا ہے۔ ہر گزرا ہوا لمحہ خواہ وہ کسی بھی شعبے سے وابستہ ہو تاریخ بن جاتا ہے اور اس تاریخ نیز قلبی واردات کو قلم بند کرنا اور شعری قالب میں ڈھالنا رفیع سرسوی کو بہت اچھی طرح آتا ہے۔ وہ ان تمام حادثات و واقعات کو قلم کی گرفت اور اپنی ذہنی اپروچ میں لانے کے لیے مختلف قسم کے استعارے، علامتیں، تشبیہیں اور کنائے استعمال کرتے ہیں تاکہ ان کے عہد کا منظر نامہ فقط ایک روداد نہ بن جائے بلکہ اس روداد میں وہ شعری چاشنی، ادبی پیرایہ اور فنی انداز و بیان پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس عمل میں وہ کامیاب ہی نہیں بلکہ بھرپور کامیاب نظر آتے ہیں۔ ملک گیر اور عالمگیر سطح پر ہونے والے مسلسل واقعات کو وہ فنکارانہ ہوش مندی، چابک دستی، متانت اور سنجیدگی کے ساتھ مختلف ردیفوں اور قافیوں کا سہارا لے کر پیش کرتے ہیں۔ جیسا کہ راقم نے اوپر ذکر کیا ہے کہ وہ روداد کو شعری چاشنی دینے کے لیے اور ادبی پیرایہ پیدا کرنے کے لیے کنائے، استعارے اور تشبیہات سے برابر کام لیتے ہیں۔ یہاں کچھ لفظیات پیش کی جارہی ہیں جو انہوں نے اپنی غزلوں میں بطور کنائے، استعارے اور تشبیہات استعمال کی ہیں۔ ان لفظیات کو پیش کرنے کا مقصد کھتونی بنانا نہیں ہے بلکہ قاری کو یہ احساس کرانا ہے کہ کیسے وہ رونما ہونے والی روداد کو شعری لباس زیبِ تن کراتے ہیں نیز یہ شعری لباس تلمیحاتی، اساطیری اور افسانوی سفر کرتا ہوا قاری کے ذہنوں پر راست اور براہِ راست دستک دیتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے کچھ لفظیات:

رگِ جاں، پابندِ سلاسل، معراجِ سخن، محتاجِ کفن، نوکِ سناں، اُجالوں کی زکوۃ، پرانے برتن، حاکمِ شہر، خنجرِ دستِ جفا، وجودِ حرف جمالِ اشک، طائرِ فکرِ رسا، جہازِ آرزو، صحنِ سجدہ، نیر خاکِ شفا، نگاہِ چشمِ عرفان وشعورِ آگہی، خوفِ فنا، رختِ سفر، دیارِ شام چشمِ غیرت، چہرۂ پروانہ، چراغِ خیمۂ انصار، شعورِ وفا، حسبِ روایت، اعجازِ محبت، طرزِ محبت، سرِ بازار، احساسِ حیا، امیرِ شام، افراطِ حیا، دم ہجرت نوکِ نیزہ، کثرتِ لشکر، امیرِ شہر، پاسبانِ شہر، شبِ وصل، دامنِ تاریخ، جذبۂ شوقِ شہادت، خنجرِ خونخوار، شمشیرِ قلم، طوقِ گراں، طالبِ دیدار، خورشیدِ سحر، سامانِ سفر، منظورِ نظر، رنگِ ہنر، آئینۂ کربلا، مالِ غنیمت، منتہائے فکر، قصرِ جنت، خونِ مظلوم، گلدستۂ شباب، محوِ اذاں، پسرِ قاتل مظلوم، علاماتِ شقِ قلب، ردائے تنگ، خطائے ننگ، متاعِ رنگ، رازِ مؤدت، میتِ کشتہ، جذبۂ دید، دخترِ غربت، دعوتِ عجل، خیرالعمل، لم یزل، امتیازِ فاضل و جاہل، شہرِ محبت، متاعِ حسن، شوقِ شہادت، قصۂ علی بابا، جنازۂ تہذیب، آتشِ نمرود، دلِ سراب، انتظارِ پیمبر، معراجِ وفا، کشتیِ بحرِ مظالم، دریائے نیل، فخرِ یوسفِ حسنِ جمیل، امتیازِ حبیب وخلیل، شجرۂ دوزخ، سرنامۂ دوزخ، صراطِ حق، نورِ عین، نشانِ علم، اوجِ سکندری، جراًتِ بے شیر۔

ان مذکورہ بالا لفظیات اور تراکیب کے مطالعے سے قاری کو اس بات کا اندازہ بخوبی ہو جائے گا کہ رفیع سرسوی لفظوں کے انتخاب اور بندش میں کتنی جانفشانی اور عرق ریزی سے کام لیتے ہیں۔ ان کی آمد و سروش میں وہ اکتسابی کیفیت شامل ہے جسے آورد نہیں بلکہ کوزہ گر کے عمل سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ کوزہ گری کا عمل صرف رفیع سرسوی کی ذات پر ہی نافذ نہیں ہوتا بلکہ ہر اچھے فنکار پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ جس میں فنکار کی فہم و فراست، احساس و توجہ اور ادراک جیسے عوامل برابر شامل حال رہتے ہیں۔ موصوف کی غزلوں کے مطالعے سے یہ احساس بخوبی ہو جاتا ہے کہ وہ ادراک اور استدراک دونوں کیفیتوں سے برابر گزرے ہیں اور گزرنا بھی چاہیے کیونکہ جب تک فنکار ان کیفیتوں سے نہیں گزرے گا تو اس کا قوتِ مشاہدہ اور تجربہ ناقص رہے گا۔ چنانچہ اس کی دور بینی، دور رسی اور ژرف نگاہی معراجِ فن سے بعید ہو جائے گی۔

رفیع سرسوی کی کائناتِ غزل اور بساطِ غزل پورے سماج اور معاشرے کا المیہ اور کرب ہے۔ ان کے یہاں لفظِ کربلا کی معنویت بدل گئی ہے۔ ان کے نزدیک کربلا صرف اہلِ بیت کی روداد نہیں ہے بلکہ جو افراتفری، بے راہ روی، کجروی، بدعنوانی، غبن اور کرپشن کا دور دورہ ہے، اصل میں وہی کربلا ہے۔ ان کے نزدیک ہر دور میں ہونے والا ظلم و جبر، ناانصافی، حق تلفی اور تشدد کربلائی زمرے میں شامل ہے۔ ان کی نظر میں فرعون صرف موسیٰ کے دور کا فرعون نہیں ہے، نمرود صرف ابراہیم خلیل اللہ کے زمانے کا نمرود نہیں ہے، یزید صرف امام حسینؑ اور امام حسنؑ کے عصر کا یزید نہیں ہے بلکہ نمرود، فرعون اور یزید ہر دور اور ہر زمانے میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ بس ان کی شکلیں بدل جاتی ہیں۔ ہمیں ان شکلوں سے نقاب کشائی کرنی ہے اور ان کے خلاف محاذ چھیڑنا ہے۔ درحقیقت رفیع سرسوی کی شاعری فسطائی طاقتوں کے خلاف اعلانِ جنگ بھی ہے، مہم بھی اور محاذ بھی۔ یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ یہ محاذ اور اعلانِ جنگ صرف رفیع کی ذات سے وابستہ نہیں ہے بلکہ ان کا یہ محاذ اور اعلانِ جنگ آفاقی نوعیت کا ہے۔ جس کو انہوں نے اپنی ذات سے وابستہ کر کے پوری کائنات سے جوڑ دیا ہے۔ چنانچہ یہ عالمگیر وابستگی کا عمل ہی فنکار کو عظمت کا حامل بناتا ہے۔ بقول خود شاعر:

کربلا، لفظ غزل میں بھی گر آ جاتا ہے
خود بخود ہوتے ہیں نمناک قلم اور کاغذ
آنسوؤں کے ساتھ مائیں دستکیں دیتی رہیں
ذہن و دل میں کربلائیں دستکیں دیتی رہیں
جستجو قاتل کی ہے خنجر سمیت
کربلا آنکھوں میں ہے منظر سمیت
درد فاقوں کا بچے بھول گئے
کربلا یوں سنا رہا ہوں میں

رفیع سرسوی کی غزلوں میں قاری کو قدم قدم پر اور جگہ جگہ فسطائی زمانے کی گونج، افراتفری، بدنظمی اور غیر انتظامی امور دکھائی دیں گے۔ سب سے خاص بات ان کے کلام کی یہ ہے کہ وہ اس اعلانِ جنگ کو اتنی خوبصورتی اور استعاراتی عمل کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ ان کا کلام ترقی پسند شاعروں کی طرح نعرہ بازی نہیں بنتا بلکہ ان کا یہ اعلانِ جنگ اور مہم خالص ادبی رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو رفیع سرسوی کا کلام سماجیات اور سیاسیات کا شعبہ ہے۔ ایسا کون سا نقطہ، زاویہ، پہلو اور مسئلہ نہیں کہ جس کو انہوں نے اپنی غزلوں کا حصہ نہ بنایا ہو۔ پورا سماجی علوم اور سیاسی علوم کا مطالعہ ان کے کلام کی روشنی میں کیا جاسکتا ہے اور اسی سیاسی اور سماجی علوم کے درمیان وہ نفسیاتی کیفیتیں بھی جنم لیتی ہیں جن کا تعلق افلاس، بھکمری، بے بسی، لاچاری، غربت، مفلسی، بدحالی، مفلوک الحالی، دہشت گردی، وحشت و خوف، بیابانی و ویرانگی، مبروص ہوتے چہرے اور مفلوج ہوتے ذہن اور خوف و دہشت کے باعث مرتعش ہوتے اجسام سے ہے۔ بلکہ اگر یوں کہہ دیا جائے کہ اپاہج نظامِ حکومت اور نظامِ معاشرے سے ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ رفیع سرسوی کی باریک نگاہیں ان تمام نکات اور پہلوؤں پر جمی رہتی ہیں۔ ان کا فکری ارتکاز اور تخیل کا محور ان زاویوں سے ہٹنے کا نام نہیں لیتا ہے۔ کیوں کر ہٹ سکتا ہے؟ وہ تو خود اعتراف کرتے ہیں:

اے رات گزر جا کہ اجالے کی طلب ہے
ہر سمت اندھیروں میں گھٹن دیکھ رہا ہوں
راز کھل سکتا ہے افلاس کا نادانوں سے
اس لیے بچے چھپا لیتا ہوں مہمانوں سے
فاقے بچھا کے اور امیدوں کو اوڑھ کر
بستی میں ایک امیر کے زیرِ مکاں رہے
تڑپ تڑپ کے مرا وہ مریض مرنا تھا
کدھر سے گاڑی گزرتی سڑک پہ دھرنا تھا
مفلسی میں بھوک بھی کیا چیز ہے
بک گئی بیوہ کوئی بستر سمیت

زیرِ نظر مجموعہ ''گریہ نیم شب'' دراصل رفیع سرسوی کے نیم شب کا گریہ یا نوحہ نہیں ہے بلکہ یہ گریہ و بکا، آہ و زاری اور فریاد و ماتم اہلِ ایام کا نوحہ ہے۔ بنیادی طور پر دیکھا جائے تو یہ مجموعہ رفیع سرسوی کی زندگی کا مرثیہ بھی ہے اور نوحہ بھی۔ جس کو انہوں نے اپنی ذہانت اور تخلیقی بصیرت سے عالمگیر نوعیت کا بنا دیا ہے۔ انہوں نے زندگی بھر جو نشیب و فراز، بلندی و پستی اور مد و جزر دیکھے ان کو اپنی شاعری کا حصہ بنا دیا۔ ایسا حصہ کہ جس میں ایک بے انتہا کرب و درد ہے، سوزِ نہاں ہے، دل کی کسک ہے، ستم ظریفی ہے، بے بسی ہے، لاچاری ہے، تڑپ ہے نیز وہ چیخیں، فریادیں اور ماتم ہیں جو تقریباً چالیس برس پر محیط ہیں۔ ان کا یہ مجموعہ ''گریہ نیم شب'' درحقیقت ایک ایسا دستاویزی مجموعہ ہے جس میں ستم ظریفی اور ٹریجڈی کی سسکتی اور بلکتی ہوئی آوازوں کا انضمام ہے۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے کہ رفیع سرسوی کی غزلیہ شاعری اکیسویں صدی کا منظر نامہ ہے اور بیسویں صدی کے آخری عشروں کی روداد۔ موصوف کی یہ روداد ایسی ہے کہ جس میں انہیں پرچھائیوں میں بھی موت نظر آتی ہے اور ظلمتیں صف بہ صف گول دائرہ بنا کر ہر طرف کھڑی ہوئی ہیں۔ وہ اس ظلم و جبر کو بھی شعری پیراہن عطا کرتے ہیں کہ جب برسرِ اقتدار لوگ مفلس کی بیٹی کی اجتماعی طور پر آبرو ریزی کرتے ہیں یا اسے گھر سے جبراً اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں شعر دیکھیے:

اٹھا کے لے گئے بیٹی غریب کے گھر سے
سنا ہے ٹولا یہ بستی کے لوفروں کا تھا

بےلاگ و لپیٹ اور اساسی طور پر رفیع سرسوی کی شاعری کے تعلق سے جب بھی بات کی جائے گی تو ان کے متن پر گفتگو کرنے والا ہر صاحب نقد انہیں بطور مستقل شاعر ہی تسلیم کرے گا مگر علاوہ ازیں ان کے فن پاروں اور غزلوں میں سماجی، سیاسی اور تاریخی مسائل کے علاوہ وہ عناصر اور پہلو بھی کارفرما ہیں جنہیں حسن و عشق و محبت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک انسان جو جسدِ خاکی کا مجموعہ ہے وہ حسن و عشق و محبت جیسے لوازمات اور تقاضوں سے محروم رہ سکتا ہو۔ بھلے ہی اس کی زندگی سراپا کرب و درد کا مجموعہ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اس کرب و درد سے نکلنے کے لیے کبھی کبھی تو کرب و درد میں گرفتار انسان بھی حسن و عشق و محبت کی باتیں کر لیتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ رفیع سرسوی تو ایک شاعر ہیں۔ اگر شاعر حسن و شباب کی بات نہ کرے گا تو پھر کون کرے گا۔ چنانچہ رفیع سرسوی کے اس مجموعے میں وہ عناصر، پہلو اور زاویے بھی سانس لیتے اور ابھرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جن کا تعلق عشق و محبت کے رموز و اسرار سے ہے۔ اس سلسلے میں کچھ شعر پیش کیے جاتے ہیں:

سلگتی دھوپ میں ہم بے کسی کے دن نہیں بھولے
لبِ دریا شبابِ تشنگی کے دن نہیں بھولے

پھر سے پلٹ کے آ گیا عہدِ شباب میں
آیا ہے کون پردہ نشیں میرے خواب میں

جیسے چھپا ہو چاند کوئی ابر میں رفیع
وہ لگ رہے ہیں اس طرح رہ کر نقاب میں

جب غزل شہر کی سڑکوں پہ کنواری نکلے
شاہ زادے کی طرح فکر ہماری نکلے

مذکورہ بالا اشعار سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ رفیع سرسوی کی جبلت و سرشت، شریانوں اور لاشعوری پناہ گاہوں میں کہیں نہ کہیں حسن و عشق کے جراثیم پیوست ہیں۔ اگر چہ ان کی زندگی اور ان کے مجموعۂ کلام کو پڑھنے کے بعد نیز ان کے عمرانی اور سماجی پہلوؤں کو جاننے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ زندگی بھر حق کے لئے آواز بلند کرتے رہے۔ مگر کبھی نہ کبھی تو ان کی زندگی میں بھی محبت کا انکور پھوٹا ہوگا۔ تبھی تو وہ پہلے شعر میں کہتے ہیں کہ سلگتی دھوپ میں ہم بے کسی کے دن نہیں بھولے اور لبِ دریا پر شبابِ تشنگی کے دن بھی انہیں اچھی طرح یاد ہیں۔ اگر چہ نامساعد اور ناساز گار حالات نے انہیں حسن و شباب کی کیفیتوں سے ہمکنار ہونے نہ دیا۔ یہاں حسن و شباب کو میں قید کرنا نہیں چاہتا ہوں بلکہ حسن و جمال و شباب سے میری مراد کائنات کی ہر خوبصورت شے سے ہے۔ ہر وہ شے جو انسان کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے، جس میں دلکشی ہے، مدہوشی ہے، رعنائی ہے، غنائیت ہے، نغمگی ہے، موسیقیت ہے۔ جو دلوں کو سکون اور دماغ کو تازگی عطا کرتی ہے۔ جس کو دیکھ کر مسرت اور شادمانی کا احساس ہوتا ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود بھی وہ اپنی شاعری کے اساسی وصف کی وجہ سے یہی کہتے ہیں:

جو صنفِ غزل کرب و بلا تک نہیں آتی
لفظوں کی رسد فکرِ رسا تک نہیں آتی

رفیع سرسوی کے کلام کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ بھی بخوبی ہو جاتا ہے کہ وہ خالص مشرقی اقدار کے دلدادہ پروردہ اور پاسبان ہیں۔ انہیں مشرقی قدریں، مشرقی تہذیب و ثقافت اور سنسکار بے حد عزیز ہیں۔ انہیں یہ گوارا نہیں کہ ایک مشرقی لڑکی برہنہ سر اور چست قبا ملبوس کرے۔ ان کے نزدیک ہر چیز دائرے میں اچھی لگتی ہے۔ کوئی بھی معاملہ ہو جب دائرے کو عبور کیا جاتا ہے تو وہاں بگاڑ کی علاوہ کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ آج کی شکست و ریخت ہوتی تہذیب اور اقدار کے تئیں وہ بیدار نظر آتے ہیں۔ اس پر وہ کافی افسوس کا اظہار بھی کرتے ہیں اور اس جانب قاری کی توجہ بھی مبذول کراتے ہیں۔ انہیں یہ بالکل برداشت نہیں ہے کہ اسلامی تہذیب اور مشرقی شعار درہم برہم اور تار تار ہو جائے۔ وہ ہر لحاظ اور ہر پہلو سے اپنی تہذیب کی نگہبانی کرتے نظر آتے ہیں۔ آج کل امت جس بے راہ روی اور کجروی کا شکار ہے، اس پر وہ اپنے شعروں میں بار بار ذکر کرتے ہیں ان کی نگاہیں بدلتے ہوئے منظر نامے پر بہت گہری رہتی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان قوم اس راہ کو چنے جس کا ذکر اللہ نے سورہ فاتحہ میں کیا ہے اور اس راستے سے توبہ کرے جو امت کو بربادی اور تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔ اس تمہید کے تناظر میں کچھ شعر پیش کیے جاتے ہیں:

بیٹیاں آج کھلے سر چھپیں اخباروں میں
کیا ہوئی گھر کے بزرگوں کی حمیت لکھنا

دل کا ناسور ہے کردار اسی بیٹے کا
گود میں ماں نے جسے پالا تھا ارمانوں سے

بیوہ نے جن کے واسطے مزدوریاں کریں
بیٹوں میں کس کے ساتھ یہ جھگڑا ہے ماں رہے

یہ مرے گھر کی روایت ہے میں کیسے توڑ دوں
جب بڑوں کے درمیاں بیٹھیں تو کم بولا کریں

الغرض یہ بات ان کے کلام کی روشنی میں مدلل کہی جا سکتی ہے کہ رفیع سرسوی ایک ایسا شاعر ہے جو اپنے ہم عصروں میں فقط ممتاز ہی نہیں ہے بلکہ وہ اپنے خیالات نظریات اور احساسات کے باعث منفرد بھی ہے۔ ان کی شاعری کے موضوعات انہیں جدیدیت کی طرف لے جاتے ہیں۔ سب سے خاص بات ان کی شاعری کی یہ ہے کہ انہوں نے جن جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے اور جن مسائل کو انہوں نے اپنی شاعری کا اٹوٹ حصہ بنایا ہے اس میں ان کا طرزِ بیان صاف دکھائی دیتا ہے۔ ان کے اسلوب اور طرزِ نگارش پر کسی شاعری کی چھاپ نظر نہیں آتی ہے بلکہ وہ اپنے طور پر ردیف و قافیہ کی بھی اختراع کرتے ہیں اور اپنے ہی انداز سے اپنا اسلوب گھڑتے ہیں۔ ان کی شاعری بلا شک و شبہ اس عہد کا منظر نامہ ہی نہیں بلکہ اپنے اندر ایک تاریخ کو بھی سمیٹے ہوئے ہے۔ وہ صرف احساسات و جذبات کے ہی شاعر نہیں بلکہ وہ مسائل اور موضوعات کے شاعر ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں انہی پہلوؤں اور نکات کو پیش کرتے ہیں جن میں کوئی مقصد اور پیغام پوشیدہ ہوتا ہے۔ ان کی زیادہ تر شاعری مقصدی سروکاروں سے وابستہ ہے اور جس میں ایک پیغام پوشیدہ ہے۔ جسے سمجھنا قاری کے لیے بے حد ضروری ہے۔

□□□

فوزیہ سلطانہ

مُلّانا، مکان نمبر-28، پوسٹ۔ پھولپور، ضلع۔ الہ آباد

9532629904

”زیبرا کراسنگ کے درمیان“ تجزیاتی مطالعہ

فکشن دنیا و مافیہا کو درپیش واقعات کا فنکارانہ عکاس ہے۔ فکشن یہ دنیا یہ عالم اور جو کچھ اس میں ہے، دنیا اور دنیا کے سارے متعلقات سامنے روبروز یر بحث جو ماضی میں ہو چکے ہیں حال میں ہو رہے ہیں اور جو مستقبل میں ہو سکتا ہے کاریگری اور پیش ورانہ آئینہ دار اور مظہر ہے۔

ڈاکٹر مجاہد الاسلام جو کی دربھنگہ ضلع کے باڑھ سمیلا بستی میں 10 اگست 1962ء میں پیدا ہوئے۔ شروعاتی تعلیم گاؤں میں ہی حاصل کی پھر مدرسہ جامعتہ الفلاح بلریا گنج، سے عالمیت/فضیلت 1982ء میں مکمل کی۔ پھر اردو کے اس عاشق نے علم ادب کے گہوارے گل سرسرید کا رُخ کیا۔ بی اے اور ایم اے کی تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی پھر ملک کی نامور درسگاہ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی JNU سے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کی، اب تک ڈاکٹر مجاہد الاسلام کی کئی تحقیقی، تنقیدی و ترتیب کردہ کتب منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ انکی پہلی تصنیف انکا پہلا افسانوی مجموعہ ”بدن کی خوشبو“ ہے 2012ء میں شائع ہوا۔ ادب اور ابلاغ (تنقیدی مضامین) 2015ء میں شائع ہوا جس پر انہیں یوپی اردو اکادمی سے انعام بھی ملا۔ فرہنگ کلیات سودا 2017ء (تحقیق) یوپی اردو اکادمی ایوارڈ ملا۔ تحلیل و تجربہ (تنقیدی مضامین) 2018ء، تنقیدات وتشریحات (ترتیب) 2019ء، محاسن ومعائب (تنقیدی مضامین) 2020ء۔

تنقیدی اور تحقیقی مضامین باضابطہ طور پر اردو کے نامور رسایل میں اکثر و بیشتر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جو بالکل منفرد خاص موضوعات پر اور اچھوتے ہوتے ہیں۔ آپکو افسانہ نگاری پر بلونت سنگھ ایوارڈ اور برائے تحقیق مالک رام ایوارڈ سے بھی نوازا جاچکا ہے۔ مجاہد الاسلام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے میگزین مسعود 1987ء میں ترتیب دے چکے ہیں۔ بطور صحافی بھی اردو کی خدمت انجام دی ہے۔ آپ اس وقت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی Mannu لکھنؤ کیمپس میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔ درس تدریس میں مشغول رہتے ہیں مطالعے کو اپنا شعار سمجھتے ہیں، عاشق اردو ہیں۔ اردو، ہندی، عربی، فارسی، انگلش جاننے والے کثیر اللسان ادیب ہیں۔ اب تک آپ کے دو افسانوی مجموعے بدن کی خوشبو 2012ء، اور ”فلائی اوور کے درمیان 2014ء“ اور تیسرا مجموعہ جو میرے زیرِ مطالعہ ہے ”زیبرا کراسنگ کے درمیان“ ہے جو 2023ء میں شائع ہوا۔ 32 افسانوں پر مشتمل ہے۔ انتساب ”مادرِ علمی جے این یو میں گزارے ہوئے ان خوبصورت لمحات کے نام جنہوں نے مجھے ایک حسِ لطیف بخشا اور کشادہ ظرفی، وسعت قلبی، فکر ونظر کی آزادی اور علمی مجاہدے کا ذوق عطا کیا“ کے عنوان سے کیا ہے۔ انتساب کو مدنظر رکھیں تو آپکو اس افسانوی مجموعے میں یونیورسٹی کالج کلچر اور پڑھا لکھا معاشرہ جوان اور Depressed اداس نوجوان نسل جنسیت جنسی بے راہ روی کھوئے ہوئے اور خود کو پانے کی جدو جہد دکھائی دیتی ہے آج ہمارا نوجوان معاشرہ کن کن تکلیفوں میں مبتلا ہے جسے وہ جگ ظاہر نہیں کرسکتا خود میں گھٹ رہا۔ کالج یونیورسٹی اور اپنے معاشرے میں سامنے روبرو جو دیکھا اور محسوس کیا ہے ان موضوعات کو اٹھایا اور اپنے افسانوں میں بخوبی نبھایا ہے جیتی جاگتی تصویر کو ہمارے سامنے ابھارا ہے۔ آپ افسانوی دنیا میں جہاں مختلف موضوعات بکھرے ہوئے ہیں۔ وہیں ان موضوعات میں عورت اور مرد کا وہ رشتہ جس سے یہ دنیا اور خلق خدا آباد ہے۔ اور جنسی بے راہ روی ہے جس پر سماج میں کھل کر بات کرنے میں ممانعت ہے۔ انسان اسی رشتے میں چاہت اور تسکین حاصل کرنے کے لیے جرائم تک کر بیٹھتا ہے۔ ہوس پرستی میں انسان کو انسان سے حیوان بھی بن بیٹھتا ہے۔ ڈاکٹر مجاہد السلام حرف چند میں رقمطراز ہیں۔ ”عورت اور مرد ہمارے سماج کی بنیادی وحدت ہیں، انکی تکثیر سے ہی سماج کا وجود عمل میں آیا ہے۔ اس سماج اور معاشرے کی بنیادی اکائی کو جوڑنے والی جو چیز ہے وہ رشتۂ الفت ہے۔ مرد وزن جو ہمارے سماج کی اکائی ہیں۔ اگر اس میں صرف حسن کا ہی پہلو ڈھونڈنے کی کوشش کی جائے تو بہر حال مایوسی ہوگی اس لیے کہ خوبصورتی کی طرح بدصورتی بھی ایک حقیقت ہے۔ جس طرح اجالے کے ساتھ اندھیرا، شام کے ساتھ سویرا ہے۔ اسی طرح نیکی کے ساتھ بدی ازلی حقیقت ہے۔“

> ”افسانہ ”کیپری“ ہے کرتیکا اہم کردار ہے جو آئی اے ایس آفیسر کی بیٹی ہے۔ والدین کے پاس بیٹی کے لیے وقت نہیں صرف ضرورتیں پوری کرنے کے لیے پیسے ہیں، بے شمار پیسے۔ کرتیکا یونیورسٹی ہاسٹل میں رہ کر کامپٹیشن امتحان کی تیاری کررہی ہے۔ مرد عورت کے حسں رشتے کو ہر مذہب اور سماج نے ایک حدود اور ضابطے طے کیے ہیں۔ رشتہ ازدواج ہے کچھ رسم اور ریتی رواجوں سے رشتے جوڑے جاتے ہیں۔ اس کہانی کا موضوع بالکل ہی منفرد ہے۔ ہم اکثر و بیشتر یہی دیکھتے ہیں۔ کالج یونیورسٹی یا اپنے آس پاس کی ایک لڑکا لڑکی کی محبت میں دیوانہ وار پھرتا ہے اور اسکے سارے شوق شنگار بھی خود پورے کرتا ہے۔ تحائف پر تحائف اور بہترین ریستوران میں کھانا گھماتا پھراتا ہے۔“

اس افسانوی مجموعے کا پہلا افسانہ

افسانہ ”کیپری“ میں کرتیکا کا اہم کردار ہے جو آئی اے ایس آفیسر کی بیٹی ہے۔ والدین کے پاس بیٹی کے لیے وقت نہیں صرف ضرورتیں پوری کرنے کے لیے پیسے ہیں، بے شمار پیسے۔ کرتیکا یونیورسٹی ہاسٹل میں رہ کر کامپٹیشن امتحان کی تیاری کر رہی ہے۔ مرد عورت کے حسن رشتے کو ہر مذہب اور سماج نے ایک حدود اور ضابطے طے کیے ہیں۔ رشتہ ازدواج ہے کچھ رسم اور ریتی رواجوں سے رشتے جوڑے جاتے ہیں۔ اس کہانی کا موضوع بالکل ہی منفرد ہے ہم اکثر و بیشتر یہی دیکھتے ہیں کالج یونیورسٹی یا اپنے آس پاس کی۔ ایک لڑکا لڑکی کی محبت میں دیوانہ وار پھرتا ہے اور اسکے سارے شوق شنگار بھی خود پورے کرتا ہے۔ تحائف پر تحائف اور بہترین ریستوران میں کھانا گھماتا پھراتا ہے۔ لڑکی کا چھوٹے سے بڑے شوق پورا کرتا ہے۔ اس افسانے میں کرتیکا بغیر شادی کے لیو اِن ریلیشن میں رہنے لگتی ہے۔ شفاف محبت میں اپنے عاشق کے سارے خرچ بھی خود اٹھاتی ہے۔ اچانک لڑکے کی ماں کی طبیعت خراب ہونے پر وہ گاؤں چلا جاتا ہے کرتیکا گاؤں خط بھیجتی ہے۔” خط آیا جس میں اور باتوں کے علاوہ لکھا تھا کہ میں نے تمہارے کپڑے خود اپنے ہاتھوں سے دھوئے اور پریس کیے ہیں سوائے اس ’کیپری‘ کے جس کو میں رات کو اپنے ساتھ لے کر سوتی ہوں اور جس میں تمہارے بدن کی خوشبو محسوس کرتی ہوں۔ آخر کب تک میں تمہاری اس ’کیپری‘ کے سہارے اپنا وقت گزاروں؟ اب مجھے راتوں کو نیند بھی بہت کم آتی ہے پچھلی رات عالم تخیل میں تمہاری اس ’کیپری‘ کو اپنے ہاتھوں کی مٹھیوں میں کچھ اس طرح سے بھینچا کہ میری دونوں ہتھیلیاں لہولہان ہوگئیں۔ تم جلدی آؤ۔ وغیرہ وغیرہ“

(کیپری، مشمولہ زیبرا کراسنگ کے درمیان، ص 16)

گاؤں سے واپس آنے پر کرتیکا اسے اپنے حاملہ ہونے کی خبر دیتی ہے اور شادی کرنے کو کہتی ہے پر وہ صاف بہانے بنا کر شادی سے انکار کر دیتا ہے پھر مجبوراً کرتیکا کو ابارشن کرانا پڑتا ہے۔” لیبرل روم میں جاتے وقت کرتیکا نے کچھ اس طرح بے بس نظروں سے میری طرف دیکھا میں تھرا کے رہ گیا۔ میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا، میں اندر سے گھلا جارہا تھا۔ پھر کچھ ہی دیر میں کرتیکا باہر آگئی۔ اسکے کپڑے مڑے تڑے تھے وہ نیم غنودگی کی حالت میں تھی۔ دو نرس دونوں طرف سے اسے تھامے ہوئی تھیں۔ پھر اسے پاس پڑے بیڈ پر لٹا دیا۔ اس کی عجیب وغریب حالت دیکھ کر مجھے اس پر بڑا ترس آرہا تھا معصومیت اس کے چہرے پر عیاں تھی۔“

(کیپری، مشمولہ زیبرا کراسنگ کے درمیان، ص 17)

پھر کرتیکا سے ملنا کم ہوگیا دھیرے دھیرے کرتیکا نے دوری اختیار کرلی پھر ڈھابے پر کرتیکا دکھی۔ کورٹ میرج کی ہے وہ لڑکا بھی اسکے پیسوں سے کھا رہا ہے۔ وہ ہی بل ادا کر رہی تھی مانگ میں سیندور ہے پر چہرے پر خوشی نہیں فاتح خوشی تو اس لڑکے کے چہرے پر ہے جس سے کرتیکا نے کورٹ میرج کی تھی۔ * افسانہ ”سچی محبت“ کا اہم کردار پارو ایک کتیا جس کو بہت سے کتے چاہتے ہیں گلی میں لائن لگی ہوتی ہے اور جھگڑے ہوتے۔ پھر کرسٹوفر پارو پر فتح حاصل کرتا ہے۔ پاروں کے بچے ہوتے کچھ مر جاتے ہیں کچھ کو دوسرے محلے کے بچے پال لیتے ہیں۔ دو پلّوں کو کرسٹوفر موقع دیکھ ایک ایک کر مار دیتا ہے اور پارو کا شریک غم بن کر اسکے ساتھ ہوتا ہے۔ کرسٹوفر اپنی محبت میں اپنے خود کے بچوں کی شراکت برداشت نہیں کرتا اور پارو کو مکمل خود کے پیر دبا چاہتا ہے۔

* افسانہ ”ورجنٹی“ اہم کردار نندنی ہے جو اس سے محبت کرتی ہے۔ گاؤں جانے پر فون بند ہوا تو بند ہی ہوگیا کالج جا کر یہ بات پتہ چلی نندنی حمل سے تھی اسقاط حمل کے لیے حکیم کی دوا کھالی وہ ساتھ ہی تھا۔ وہ زہر پھیلنے سے مرگئی۔ اس افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

”میرے اصل قاتل تم ہو۔۔۔ حقیقت میں میں اسی وقت مر چکی تھی، جب میں تمہارے رابطے میں آکر اپنی ورجنٹی (virginity) کھوتی تھی......!!

انیتا کالج فیلو آج اسکے قریب آنا چاہتی ہے پر وہ چاہتا ہے کہ کوئی اور لڑکا اسکی ورجنٹی ختم کرے کیونکہ وہ انیتا کی ورجنٹی خود ختم کرا سکا قاتل نہیں بننا چاہتا اس لیے انیتا کے قریب جانے سے تھراجاتا ہے اور نندنی کی حالت اسے یاد آجاتی ہے اور وہ در پردہ خود کو نندنی کا قاتل تصور کرتا ہے ∴ افسانہ ”پگڈنڈی“ ماضی کی غلطیوں کو بھول کر آگے بڑھنا بھی چاہوں ماضی ہمارا پیچھا کرتا رہتا ہے آج وہ ماں بننا بھی چاہتی ہے پر ماں نہیں بن پاتی ماضی کی غلطیوں کے سبب۔ یہ افسانہ آدمی کے شکی مزاج کی بھی عکاسی کرتا ہے مرد کا ماضی داغدار بھی ہو وقت کے ساتھ دامن صاف ہو جاتا ہے، وقت عورت کے ماضی کو بھولنے نہیں دیتا اگر ماضی زبان سے ذرا مذاق میں بھی نکل گیا تو زندگی تباہ کر دیتا ہے۔

اقتباس ملاحضہ ہوں۔

”میرے دماغ میں ماں کی وہ بات گردش کرنے لگی جو اس نے رخصتی کے موقع پر مجھ سے کہیں تھی“ مرد بہت زیادہ وہمی اور شکی ہوتے ہیں انکے سامنے کوئی بھی ایسی ویسی بات نہیں کرنی چاہیے“

(پگڈنڈی، زیبرا کراسنگ کے درمیان، ص 132)

کورٹ میں بے عزت نہ ہو اس لیے خودکشی کی کوشش کی ہسپتال میں بھی Anxiety انزائیٹی اٹیک آتے رہتے ہیں۔ وہ مرنا چاہتی ہے اپنی ماضی کی غلطیوں کے لیے کیوں کہ اس کا مداوا نہیں ہے * افسانہ ”وسواس گھات“ انور اور روفیہ انور کالج کے درمیان روفیہ کو پڑھائی میں گائیڈ کرتا ہے محبت کرنے لگتا ہے محبت کا سلسلہ چاہتا ہے۔ روفیہ دوری اختیار کر لیتی ہے وہ بھی دہلی چلا جاتا ہے ایک مرتبہ ملاقات ہوتی ہے اس سے بالکل انجان بنتی ہے پھر خط آتے ہیں اور پھر بھولی یادوں اور محبت کے تصور میں گھلنے لگتا ہے بعد میں پتہ چلتا ہے کہ روفیہ نے شادی کر لی ہے۔ اسکو بتایا بھی نہیں کتنی بڑی وسواس گھاتی ہے * افسانہ ”مایامال“ میں وکی اہم کردار ہے جو جسم فروشی کی منڈی میں جاتا ہے جہاں ایک ایسی لڑکی سے ملتا ہے جو نہ چاہتے ہوئے بھی جسم فروشی کر رہی ہے اسے اپینڈکس Apendix ہے۔ اسکا آپریشن کرانا ہے اس منڈی میں گاؤں کے پنڈت تک آچکے ہیں وہ بہت افسردہ ہوتا ہے اور لڑکی شرمسار اپنے کام سے۔ ہر ویشیا ویشیا نہیں ہوتی کچھ مجبور بھی ہوتی یہ کہانی ہمیں یہیں بتاتی ہے۔

* افسانہ ”بیل گم“ اہم کردار زینت ہے جو گھر سے دہلی تعلیم کے لئے جس کے ذریعے ایڈمیشن لیتی ہے اسی ارشد کی وحشی پن کا شکار ہوتی ہے۔ افسانہ ”لمس کی لذت“ نمرہ اور فریدی اہم کردار ہیں کس قدر لڑکیاں محبت میں سرشار ہوتی ہیں اور ایک مرتبہ ان کی عصمت پر بٹا لگ جائے تو رشتے نہیں ہوتے۔ چاہنے والا محبوب بھی راستہ کاٹ جاتا ہے۔ افسانہ ”آتش دان“ اسلم سے اسکی فیس بک پر دوستی ہوتی تھی اس نے آخر اسے ملنے کے لیے راضی کرلیا اور روم پر پہنچتے ہی اسلم نے اسے دبوچ لیا۔ افسانہ ”بدلہ احسان کا“ اہم کردار گنیش ہے جو ایک لڑکی کو نوکری من موافق سیلری دے کر اسکی عصمت کا سودا کرنا چاہتا ہے آخر وہ خود یہاں سے دور کر کے نئی جگہ نوکری حاصل کر لیتی ہے۔

اقتباس ملاحظہ ہو“

الفریڈ کمپنی میں آج میرا پانچواں یا چھٹا دن تھا۔ میں ڈیوٹی کے بعد گھر لوٹ رہی تھی۔۔۔ گنیش میری مرضی کے برخلاف۔۔۔ میرے منع کرنے کے باوجود بس کنڈیکٹر کو میرا کرایہ دینے کی

کوشش کر رہا تھا میں نے آؤ دیکھا نا تاؤ ڈرائیور کو بس روکنے کو کہا بس ابھی ٹھیک سے رکی بھی نہیں تھی۔۔۔۔میں ایک جھٹکے سے چلتی بس سے ہی نیچے کود گئی۔۔۔

(بدلہ احسان کا، زیبرا کراسنگ کے درمیان، ص 227)

افسانہ ”چنبیلی“ اس میں عمروں میں فرق اور بے میل شادی پر بات ہوئی ہے جہاں لڑکی کے جذبات نہ سنے جاتے نہ کوئی سمجھنا چاہتا خود اسکی ماں بھی اور آخر لڑکیاں اپنے من کو مار کر ایڈجسٹ کر لیتی ہیں * افسانہ ”رکاوٹ“ موبائل کے ایڈکشن پر بات ہوئی ہے۔

* افسانہ ”زیبرا کراسنگ کے درمیان“ میں میٹرو ریل جو صرف سواری ہی نہیں آج کل نوجوان نسل کے لیے بے حیائی اور فحاشی کرنے کی روز نئی کرتوتوں کو انجام دینے کا اڈہ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں لوگوں سے ایسے لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا وہ اپنی دنیا میں مگن ہوتے۔ آج کے نوجوانوں اور معاشرے میں بے حیائی ہوس پرستی کس قدر عام ہے۔ کیا کہا جائے۔ شیلندر اور سندھیا آج بس میں خود کو قابو نہیں کر پاتے ہیں پھر بھی خود کو کنٹرول کرتے ہیں۔ اس افسانے کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

”بڑی مشکل سے دونوں ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے پریتم گریڑ کے بس اسٹینڈ پر اترے اور زیبرا کراسنگ پر قدم رکھتے ہی دونوں نے اپنے وجود پر کنٹرول کھو دیا۔“ آجکل نئی نسل میں یہ سب فحش حرکات عام ہو گئی ہے۔ انہیں نہ میٹرو کے لوگ دکھتے نہ روڈ کے راہگیر نہ پارک میں بزرگ اور بچے یہ افسانہ بڑھتی ہوئی جنسی بے راہ روی پر کھل کر باتیں کرتا ہے۔

* افسانہ ”فاصلے“ گاؤں اور شہر کے فاصلے میں کس طرح رشتوں میں بھی فاصلے آجاتے ہیں۔ اس کہانی میں یہی بیان ہوا ہے۔ افسانہ ”کانوینٹی لڑکی“ کا اہم کردار آکاش ہے اس افسانے میں پورن ایڈکشن پر روشنی ڈالی گئی اس لت میں جکڑے شخص کے حالات بخوبی بیان ہوئے ہیں * افسانہ ”انتقام“ کا اہم کردار رفعت اسکا شوہر راشد رفعت بالکل پسند نہیں کرتی راشد کو پھر مانوس ہو جاتی ہے بیٹی درخشاں ہوتی ہے، بزنس ٹرپ پر سنگاپور جاتے ہیں۔ درخشاں کی طبیعت الگ رویے سے ڈی این اے چیک اپ ہوتا ہے رفعت سے تو ڈی این اے میچ ہو جاتا ہے پر راشد سے نہیں وہ سوچتا ہے آخر رفعت نے کون سا انتقام لیا ہے۔ ایسے ہی بہت سے منفرد افسانے اس مجموعے میں شامل ہے۔ جیسے۔ مایا مال، خودکشی، چوہیا، کوڑھ مغز، دھچکا، ڈالی غلاب کی، انفریارٹی کامپلکس، نہاری، مالک مکان وغیرہ۔ المختصر یہ کہ ڈاکٹر مجاہد الاسلام نے عصر حاضر میں رونما ہونے والے جنسی واقعات اور حادثات کو بہت کامیابی سے اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔ زبان و بیان کی سطح پر محاوروں کا استعمال مناسبت اور برمحل ہوا ہے اور کثرت سے ہوا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ مجاہد الاسلام کی زبان پر گرفت خاطر خواہ مضبوط ہے۔ بامحاورہ زبان بھی انکی تحریروں کا نمایاں وصف ہے۔ بیانیہ اثر انگیز ہے۔ ایک مرتبہ کوئی افسانہ شروع کرے تو ختم کیے بغیر نہیں بیٹھ سکتا۔ کہیں کہیں کھلا پن ہے۔ پر آج کا فکشن اب نئی راہ پر ہے فکشن نے جکڑ بندیوں سے خود کو آزاد کر دیا ہے، ہر روز نئے۔ نئے تجربے ہو رہے ہیں۔ فکشن نے اپنی کہانیوں میں مرد اور عورت کے تعلقات زیادہ نظر آتے ہیں، جو فطری بھی ہے۔ انکے افسانے اس سماج کے کوڑھ مغز معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں۔ جس میں ہم سانس لے رہے ہیں۔ وہی گھٹتی زندگیاں نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر مجاہد الاسلام جنسی موضوعات پر اور اس میں پنپتے ظلم و ستم اور جنسی تشدد کو بڑی بے باکی سے بیان کرتے ہیں اور اپنے فکشن کی ایک الگ شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

□□□

غزل

اس دور میں جینے کی سزا کیسے بتاؤں
ملت سے وفاداری کو، میں کیسے نبھاؤں

اک کرب کے عالم سے گزرتی ہوں شب و روز
میں نظم لکھوں کیا، میں غزل کیسے سناؤں

ہر سمت نگاہوں میں ہے وحشت بھری دنیا
اجڑی ہوئی بستی ہے، اسے کیسے بساؤں

آنکھوں سے لہو بن کے ٹپکتا ہے جو اکثر
اس آہ کو اے دوست، میرے کیسے سناؤں

تا حد نظر بکھری ہیں انسانوں کی لاشیں
مردہ ضمیر ان کا، کہو کیسے جگاؤں

ان سوچتی آنکھوں کی اداسی کا فسانہ
رسوائی کے اسباب ہیں، میں کیسے بتاؤں

اک ہوک جو اٹھتی ہے میرے قلب و جگر میں
شاید یہ محبت ہے، بھلا کیسے بھلاؤں

ڈاکٹر حسینہ خانم
امروہہ، یوپی
7867869984

غزل

لو آگیا ہے کوہِ ندا کان نہ دھرو
اک شور ہر طرف ہے بپا کان نہ دھرو

چھپ جاؤ ان پروں میں مسافت سمیٹ لو
مسموم ہو گئی ہے فضا کان نہ دھرو

ہم بولنے کے کام پر مامور ہیں مگر
کچھ زہر بھی ہے اس میں بھرا کان نہ دھرو

ہر دل میں بے قرار سی اک لہر موجزن
ہر لب پہ ہے کسی کا گلہ کان نہ دھرو

لب حرفِ اضطراب کا پردہ نہ رکھ سکے
سمجھو کہ میں نے کچھ نہ کہا کان نہ دھرو

چھن جائے نہ کہیں یہ صدا 'جاگتے رہو'
رستے میں آئے کوہِ ندا کان نہ دھرو

حرفِ وفا کی چھاؤں میں ٹھہرو نہ دن ڈھلے
کوئی کسی کا کب ہے سدا کان نہ دھرو

محمد اسد اللہ
گلستان کالونی ناگپور
9579591149

غزل

جو ہے برسوں پرانا ٹھیک ہے کیا
وہی اک راگ گانا ٹھیک ہے کیا

بسیرا جس جگہ چیخوں کا ہو واں
خوشی کے گیت گانا ٹھیک ہے کیا

جہاں بے نام سا اک ڈر ہو دل میں
اک ایسے گھر میں رہنا ٹھیک ہے کیا

جو باتیں دل میں ہیں برسوں پرانی
وہ سب تم کو بتانا ٹھیک ہے کیا

سفینے سے ہٹا دو بادباں
کو ہوا کے ساتھ چلنا ٹھیک ہے کیا

یقینی فتح کے امکاں سے پہلے
سفینوں کو جلانا ٹھیک ہے کیا

مجھے مرنے سے پہلے سوچنا ہے
تجھے قاتل بنانا ٹھیک ہے کیا

انصر عبقاتی سید حسین ناصر سعید
شاہ گنج، نخاس، لکھنؤ
8858722110

غزل

یہ لباس زندگی اک دن اتارے جائیں گے
نام سے محشر میں ماؤں کے پکارے جائیں گے

بے جھجک رسی خدا کی تھامنے کے بعد ہی
رحمتوں کی بارشوں میں ہم نکھارے جائیں گے

ہول کا ماحول ہوگا اس گھڑی روز حساب
آگ کے دریا سے جب انساں گزارے جائیں گے

مشکلوں کو ٹھوکروں سے روندنے کا عزم ہو
پھر سفینے بالیقیں اک دن کنارے جائیں گے

چھوڑ کر رسم جہالت تھام لو قندیل علم
ورنہ اک دن دیکھ لینا سر تمہارے جائیں گے

آخرت میں جب طلب ہوگی ولایت کی مہر
خلد میں ہم بے عمل کس کے سہارے جائیں گے

کیا حسیں منظر وہ ہوگا جب شفاعت کے لئے
احمد مرسل کے عابدؔ جب دلارے جائیں گے

ہمایوں عابدؔ مرزا
قصبہ سانکھنی، بلند شہر
9868617725

غزل

ہوا نہ عشق میں کوئی شکار میری طرح
ملا نہ کوئی مجھے دل فگار میری طرح

ہے کس کا دامن دل تار تار میری طرح
ہے کون محرم فصل، بہار میری طرح

تیری طرح کے بھی دیکھے ہیں سیکڑوں میں نے
ملے تو ہوں گے تجھے بھی ہزار میری طرح

بہت سنبھال کے رکھے ہے زندگی مجھ کو
کرے گا کون اسے اتنا پیار میری طرح

گزرتا وقت انہیں سنگ میل کہنے لگا
جو کر چکے ہیں کبھی انتظار میری طرح

سکوں کی نیند سلاتی ہے دوپہر کی تھکن
امیر شہر کوئی شب گزار میری طرح

کسی کا بال برابر بھی کب لیا احساں
جمیلؔ گیسوئے ہستی سنوار میری طرح

جمیلؔ احمد جمیل
اشرف آباد، لکھنؤ
9415750888

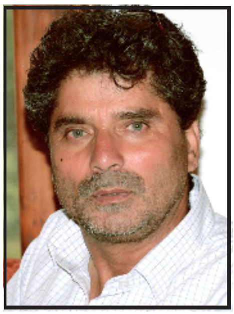

راجہ یوسف
اپنچی ڈورہ، اننت ناگ، کشمیر
9419734234

افسانہ

مکڑی

احساس؟، تہہ دار سوچ میں فکر کے دھاگوں سے بنا مکڑی کا جالا۔

اور مکڑی؟ دھاگوں کی اُلجھتی گرہ سلجھانے اور سلجھی گرہ کو اُلجھانے کا ہنر، جو کبھی احساس کو جگانے کا کام کرتا ہے اور کبھی اسے گہری خاموشیوں کے سپرد کر کے میٹھی نیند سلا دیتا ہے۔ ہنر نچوڑ ہے۔ سوچ، فکر اور احساس کی تکمیل کا۔ ہنر سے فعل لازم ہے اور جو فعل سرزد ہو جاتا ہے، اُسی کی سرزنش ہوتی ہے یا ستائش۔

مکڑی جب اُلجھاؤ اور سلجھاؤ کی اُلجھن میں پھنس جاتی ہے۔ وہ تار بُننا بھول جاتی ہے۔ ہنر کے تخلیقی پرزوں کو زنگ لگ جاتا ہے۔ وہ کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ تخلیقی عمل رک جائے تو سوچ منجمد ہو جاتی ہے۔ سوچ کا منبع تو عقل ہے اور عقل کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔

میں اس مکڑی کے اُلجھاو اور سُلجھاو کے دو پاٹوں میں پس رہا تھا۔ میرا احساس شاید مر چکا تھا۔ اگر مرا نہیں تھا، تو میری ہنر کی چابی زنگ آلودہ ہو چکی تھی۔ میں کیا تھا؟ میں کیوں تھا؟؟ میں کون تھا؟؟؟ میرے ساتھ ایسا کچھ بھی نہیں تھا جس سے ایک شخصیت اُبھر کے آجاتی ہے۔ کام جس کی پہچان بن جاتی ہے۔ میری پہچان گُم تھی۔ نہ میری سوچ کا آکار ٹھیک تھا نہ ہی میرا کام میری پہچان تھی۔ میں ہونے کے باوجود بھی جیسے تھا ہی نہیں۔ جیسے میرے وجود کا کوئی معنیٰ ہی نہیں تھا۔ کوئی مقصد ہی نہیں تھا ۔۔۔

اُس کے کرتوت ان کو ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ یہی بولے تھے وہ۔ اُس کی غزال آنکھیں۔ اُس کے دراز گیسو۔ اُس کا سجنے سنورنے کا دلکش انداز اور اُس کا بے باک رنگ ڈھنگ۔ وہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ اُن کو بھی نہیں جن کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔۔۔ لمبے ہی نہیں بلکہ ان کے ہاتھ بارود بھرے تھے۔ یہ لوگ جب کسی کے دشمن ہو جاتے تھے تو اس کی پشت پر چاہے پورا گاؤں ہی کھڑا کیوں نہ ہوتا۔

یہ پورے کا پورا گاؤں بارود کی ہلکی چٹکی سے راکھ کا ڈھیر بنا دیتے تھے۔ جس کی گونج دور دور تک سنائی دیتی تھی۔ ویسے بھی ان کے سامنے ہر کوئی جھکتا تھا۔۔۔ وہ طاقتور تھے اور طاقت ور کے سامنے ہر کمزور شخص جھکا رہتا ہے۔ طاقت ور بھی خود کو وقت کا خدا سمجھتا ہے۔ اس کو جھکے ہوئے لوگ اچھے لگتے ہیں۔۔۔۔۔ یہ سارے طاقتور، بارود کے سوداگر اس غزالہ کے دیوانے تھے۔ ہر کوئی دوسروں سے آنکھ بچا کر اسے آنکھ بھر کر دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ بھی ایک دوسرے کو کان و کان خبر کئے بغیر۔۔۔ لیکن وہ میری دیوانی تھی۔۔۔ دیوانی۔؟؟؟

ہاں تب مجھے یہی لگتا تھا۔ صرف لگتا نہیں تھا مجھے اس پر یقین تھا۔ تبھی تو وہ کسی کی پرواہ کئے بغیر میری ہو گئی تھی۔ ہمارے دن سہانے اور راتیں رنگین تھیں کہ وہ سب کود پڑے۔ ان سب نے اپنی اپنی جگہ مضبوط اور چست پلان بنا لیا تھا۔ لیکن یہ ان کی بدنصیبی تھی۔ سب سے پہلے میں آگیا تھا۔ ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں ہم نے ایک دوسرے کی نیت پہچان لی۔ میں پہلا باغی بنا تھا۔ پھر ہم سبھی ایک دوسرے کے باغی بنے۔ لیکن میں کوئی پرواہ کئے بغیر ان سے بھڑ گیا۔

"اس کے پیار کی پرتیں اب کھل چکی تھی۔ وہ مجھے بے کار شئے سمجھ کر بے اعتنائی کا شکار بنا رہی تھی۔ میرے اپاہچ پن کا بھرپور فائدہ اُٹھا رہی تھی۔ وہ میری سوچوں میں اپنی مکڑی کے جالے بننے کی کوشش کرتی رہی اور وہ کامیاب بھی ہو گئی۔ میرے تخلیقی پرزوں میں زنگ کی محرک بھی وہی تھی۔ ساتھ ہی میرے احساس کو کچوکے بھی لگائے جا رہی تھی کہ دیکھ میں جو کر رہی ہوں۔ تمہارے سامنے کر رہی ہوں اور ڈنکے کی چوٹ پر کر رہی ہوں۔ میں تو پہلے پہل اسے اپنا وہم سمجھ کر ٹالنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر ایسا کرنا اس کا بھولا پن لگا۔ لیکن جب سوچ کے تانے بانے بکھیرنے میں اس کی راست مداخلت دیکھی تو یقین ہو گیا کہ یہ اس کی ضد تھی۔ وہ جان بوجھ کر میرے ٹوٹے پھوٹے وجود کے ساتھ ساتھ میری ذہنی حس کو بھی اپاہچ بنا دینا چاہتی تھی۔"

ناکامی ان کی موت بنتی، وہ کہاں برداشت کرتے۔ انہوں نے سارا سیسہ پگھلا پگھلا کر میرے شریر میں اُتار دیا۔ لیکن اُنہیں پھر بھی بھاگنا پڑا۔ اسے خراش تک بھی نہ آنے دی۔ وہ سلامت تھی۔ اور اس کی عزت بھی محفوظ تھی۔ میں تو اسے اپنا فرض سمجھ کر بھول بھی جاتا لیکن

وہ میری اور بھی زیادہ دیوانی ہوگئی تھی۔ میں بچ تو گیا لیکن میرا آدھا شریر بے کار ہو کر رہ گیا تھا۔۔تب وہ دیر تک مجھے سہلاتی رہتی تھی۔ مجھے اپنا محسن، اپنا پیار بتاتی رہتی تھی۔ میں بھی اس کے جھانسے میں آ گیا۔نہیں وہ جھانسہ تھوڑی تھا۔ وہ تو میری خودغرضی تھی۔۔۔

میرا لالچ تھا۔۔۔ ایک اپاہج کی خودغرضی۔۔۔ یا اسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کہیئے۔۔۔جو بھی تھا لیکن اسے لالچ سے مبرا تو نہیں کہا جا سکتا ۔۔۔

جج میرا کیا فیصلہ سناتا۔ وہ مجھے کیا سزا دے دیتا۔ مجھے اس پر ہنسی آ رہی تھی۔ لیکن میں خوش بھی ہو رہا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا جج مجھے کیا سزا سنائے گا۔ تب مجھے جج کی سوچ، اس کی عقل پر بہت ہنسی آ رہی تھی۔ میں بہت دیر تک اس پر ہنستا رہا۔ اس کے فیصلے پر قہقہے مارتا رہا۔۔۔

اس کے پیار کی پرتیں اب کھل چکی تھی۔ وہ مجھے بے کار شئے سمجھ کر بے اعتنائی کا شکار بنا رہی تھی۔ میرے اپاہج پن کا بھرپور فائدہ اُٹھا رہی تھی۔ وہ میری سوچوں میں اپنی مکڑی کے جالے بننے کی کوشش کرتی رہی اور وہ کامیاب بھی ہوگئی۔ میرے تخلیقی پرزوں میں زنگ کی محرک بھی وہی تھی۔ ساتھ ہی میرے احساس کو کچوکے بھی لگائے جا رہی تھی کہ دیکھ میں جو کر رہی ہوں۔ تمہارے سامنے کر رہی ہوں اور ڈنکے کی چوٹ پر کر رہی ہوں۔ میں تو پہلے پہل اسے اپنا وہم سمجھ کر ٹالنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر ایسا کرنا اس کا بھولا پن لگا، لیکن جب سوچ کے تانے بانے بکھیرنے میں اس کی راست مداخلت دیکھی تو یقین ہوگیا کہ یہ اس کی ضد تھی۔ وہ جان بوجھ کر میرے ٹوٹے پھوٹے وجود کے ساتھ ساتھ میری ذہنی حس کو بھی اپاہج بنا دینا چاہتی تھی۔۔۔۔۔ ہاں یہ اس کا بھولا پن نہیں تھا۔ یہ میری سوچ کا بکھراؤ بھی نہیں تھا بلکہ یہ اس کی ضد تھی۔ مجھے میرے جسم کے ساتھ ساتھ مجھے ذہنی طور بھی اپاہج بنانے کی اس کی ضد۔۔۔

جج نے مجھے پھانسی کی سزا سنا دی۔ یہ بھی کوئی سزا تھی۔ پھانسی پر تو میں بہت پہلے چڑھ چکا تھا۔ کئی بار قسطوں میں چڑھا تھا۔ جب میں اپاہج ہوگیا اور وہ میری دیوانی۔ سب سے پہلے میں غفلت کی سولی چڑھا اور اپنی فکر کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈلوا دیا تھا۔ میری سوچ کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گئے اور میری حس کے بے رونق چہرے پر کالا ماسک چڑھا دیا گیا تھا۔ جس دن وہ میرے سامنے میرا مذاق اُڑاتی ساتھ والے کمرے میں۔۔۔۔۔ میری محبت کے ساتھ کھلواڑ کر رہی تھی۔۔۔ مجھے جذبات کے سلگتے توے پر لٹا کر خود واسنا کے ٹھنڈے شاور سے نہایا کرتی تھی۔ وہی تو دن تھا جب میری سوچ منجمد ہوگئی تھی۔ میرا تخلیقی ہنر زنگ آلود ہوگیا تھا۔ اور میں نے دونوں کا قتل کر دیا۔۔۔۔۔۔۔ لیکن تب میں زندہ کہاں تھا اور وہ ان کا قتل کہاں تھا۔ میں نے کب کسی کو مارا تھا۔ وہ میری سوچ کی مکڑی کا قتل تھا۔ جس نے جھالے بنانے چھوڑ دئے تھے۔ جو مجھے میرے احساس تلے ہی مار دینا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ مکڑی مجھے مار دیتی۔ میں نے اس کا قتل کر دیا۔۔۔۔۔۔

اب جج نے کسے موت کی سزا سنائی تھی۔۔۔ مکڑی کو۔۔۔ یا۔۔۔ احساس کو۔۔۔۔۔۔

مکڑی تو پھندے پہ جھول گئی تھی۔۔۔ لیکن یہ احساس۔۔۔۔ کاش یہ احساس بھی کبھی مر جاتا۔

❑❑❑

غزل

درد میں ڈوبی ہوئی شام و سحر مانگے ہے
دل بھی حسّاس ہے گردش کا سفر مانگے ہے

جس کو لے جائے بہا کر وہ اُمڈتا سیلاب
شوقِ دیدار وہی ریت کا گھر مانگے ہے

درد کی جھیل میں اک عمر بتانے والا
دل بھی کیا خوب ہے اشکوں کا نگر مانگے ہے

عارضِ حسن کو گل رنگ بنانے کے لئے
زخمِ دل آج ہی خونِ جگر مانگے ہے

قتل کے بعد وہ دیتا ہے سراسر دھوکا
میرے جینے کی دعا اب وہ اگر مانگے ہے

بے وفاؤں سے وفا مانگی ہے خورشیدؔ نے
آج ظلمت شب سے کوئی جیسے سحر مانگے ہے

خورشید دلدارنگری
غازی پور
9918650734

احمد صغیر

حنیف منزل، کوئلی پوکھر، پولیس لائن، گیول بیگھا، گیا، بہار

9931421834

افسانہ

فریم سے باہر کی تصویر

رات کے ورق پر بھیگے لفظوں کی بارش ہو رہی ہے اور میں لفظوں کے موتی چن کر اپنے کینوس پر سجا رہا ہوں کینوس پر لفظ نہیں رنگ بولتے ہیں......نہیں رنگ سے بنائی گئی تصویر.............میں کئی دنوں سے ایک تصویر بنانے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن ابھی تک وہ تصویر مکمل نہیں ہوئی ہے۔ نہ جانے کتنے آرٹ پیپر ضائع کر چکا ہوں۔ کتنے رنگ بکھیر چکا ہوں۔ کتنی ادھوری تصویریں کمرہ میں ادھر ادھر بکھری پڑی ہیں۔

جس کی تصویر بنانا چاہتا ہوں وہ عجیب خلقت ہے۔ وہ پرش ہے......مہا پرش ہے......انسان ہے......فرشتہ ہے......یا......کچھ کہہ نہیں سکتا۔ وہ میرے حواس پر اس طرح سوار ہے کہ میں اس سے نکل نہیں پا رہا ہوں۔ اسے جتنا جھٹکتا ہوں اتنی ہی شدت سے میرے حواس پر حاوی ہوتا جاتا ہے۔ وہ شہر میں نیا نیا آیا تھا۔ شہر کے لوگ کہتے ہیں وہ کئی دہائیوں سے اسی شہر میں مقیم ہے۔ ممکن ہے میں نے چند مہینوں پہلے دیکھا ہو......لیکن اس میں کوئی تو ایسی بات ہے جو میرے حواس پر چھایا ہے اور میں اس کی تصویر بنانے کے لیے پریشان ہوں۔

وہ کہاں سے آیا ہے......وہ خود چل کر آیا ہے......یا کسی نے اسے لا کر شہر میں چھوڑ دیا ہے......کسی نے بتایا وہ پہلے جنگل میں رہتا تھا پھر جنگل سے گاؤں کی طرف آیا۔ گاؤں کے لوگوں کو اپنا اسیر بنایا اس طرح کہ لوگ اس کے شیدائی ہو گئے گاؤں کے لوگ اس کے پیچھے چلنے لگے اس کی ہر بات ماننے لگے۔ جب وہ رات کو مشعل لے کر نکلتا تو پورا گاؤں مشعل سے روشن ہو جاتا۔ مرد ہی نہیں عورتیں اور بچے بھی اس کے ساتھ ہو لیتے۔

گاؤں میں جب مشعلوں کی روشنی کی حکومت قائم ہو گئی تو وہ شہر کی طرف کوچ کر گیا۔ یہ شہر اس کا نہیں تھا مگر وہ کہتا ہر شہر میرا ہے۔ ہر ملک میرا ہے......کوئی اجنبی شہر کو اپنا کیسے کہہ سکتا ہے۔ اجنبی شہر اب اس کا اپنا ہو گیا ہے۔ شہر کے لوگ دھیرے دھیرے اس کی گرفت میں آنے لگے ہیں۔ اس نے اپنے ہی خواہوں کی ایک لمبی فہرست تیار کر لی ہے۔ وہ جدھر سے گزرتا لوگ اسے سلام کرتے۔ اس کے کندھے پر ایک کپڑے کا تھیلہ ہوتا۔ اس تھیلے میں کیا ہوتا کسی نے جاننے کی کوشش نہیں کی۔ جب گرمی کی شدت کا احساس ہوتا تھیلہ سے گمچھا نکال کر چہرے سے پسینے کو صاف کرتا پھر اسے کندھے پر ڈال لیتا۔

رات کے ورق پر............کینوس............آرٹ پیپر............رنگ............

میں اس آدمی کی تصویر کیوں بنانا چاہتا ہوں۔ وہ کوئی سیاست داں، فلم اسٹار، کھلاڑی نہیں ہے......کوئی حسین و جمیل دوشیزہ بھی نہیں ہے۔ میں نے اپنے کمرہ میں ٹنگی تصویروں پر ایک نگاہ ڈالی۔ مشہور سیاست داں، مشہور ہیرو، ہیروئن، اسپورٹس مین، وادیاں، پہاڑ، جھرنے سب کی تصویریں مسکرا رہی تھیں۔ ایک بے حد حسین دوشیزہ کی بھی تصویر تھی جسے میں نے اپنے تصور سے تخلیق کیا تھا لیکن آج تک تصویر والی لڑکی کہیں نظر نہیں آئی۔ اس تصویر کو ایک امیر شخص نے خریدا تھا۔ اس کا کہنا تھا یہ میری بیوی کی تصویر ہے جو دو سال قبل اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اس نے منہ مانگی قیمت دی تھی۔ میں نے کینوس پر اس شخص کا ایک اسکیچ بنایا۔ اسکیچ بنانے کے بعد اسے ہر زاویے سے دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا لیکن میں نے اسے کبھی مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ہمیشہ تمتماتا ہوا چہرہ۔ کینوس سے اسکیچ نکال کر پھاڑ دیا۔

کئی دنوں تک میں نے پھر کوشش نہیں کی۔ میں اس شخص کے بارے میں سوچتا رہا۔ اپنے ذہن میں کئی تصویریں بناتا رہا۔ ذہن کے کمپیوٹر پر ایک تصویر فرج کر گئی۔ میں نے اسے ذہن کے کمپیوٹر سے نکال کر کینوس پر اتارنا شروع کیا۔ جب تصویر مکمل ہو گئی تو دیکھا کہ اس کی آنکھیں انگارے اگل رہی ہیں۔ میں حیرت میں پڑ گیا۔ اس طرح کی تصویر کون پسند کرے گا۔ اب میں تھک چکا تھا۔ اٹھا اور بستر پر دراز ہو گیا رات میں کسی پہر آنکھ کھلی تو دیکھا کینوس گرا پڑا ہے اور تصویر لہولہان ہے۔ میں کانپ گیا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ آج تک نہ جانے کتنی تصویریں بنائی ہیں لیکن کسی تصویر سے لہو نہیں ٹپکا۔

میں نے کینوس کو سیدھا کیا اور تصویر کو کینوس سے اتار کر رول کیا۔ اس میں ربر لگایا اور جہاں دوسری تصویریں تھیں اس میں ڈال دیا۔

"لہو کے دھبے ماند پڑنے لگے تھے۔ اس کی آنکھوں کے انگارے بھی غائب ہو گئے تھے۔ اس تصویر کو اسی طرح لپیٹ کر رکھ دیا اور کینوس پر آرٹ پیپر لگایا۔ پہلے ایک ہاتھ بنایا پھر اس کا جسم۔ اس بار چہرہ چھوڑ دیا۔ چہرہ بعد میں بناؤں گا کہ کہیں پھر اس کی آنکھیں انگارے نہ اگلنے لگے۔ میں نے تصویر ادھوری چھوڑ دی اور سونے کے لیے چلا گیا۔ رات میں جب آنکھ کھلی اور کمرہ کی روشنی جلائی تو دیکھا اس کے ہاتھ میں مشعل ہے اور اس سے آگ کی لپٹیں نکل رہی ہیں۔ میں محو حیرت تھا کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے۔ میں پریشان تھا......مگر اس کا ذکر کسی سے کر بھی نہیں سکتا تھا لوگ میرا ہی مذاق اڑائیں گے اس بارے میں بہت سوچا کہ میرے ساتھ یہ کیوں ہو رہا ہے۔ بہت غور و فکر کرنے کے بعد میں اپنے آرٹ کے استاد کے پاس پہنچ گیا کہ ان سے اس بارے میں مشورہ کروں۔ ان کو تمام باتوں کی جانکاری دی۔"

کیامیں اس کی تصویر بنانے کاارادہ ترک کر دوں ۔میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔لیکن میراضمیر کہتااس کی تصویر بنانی چاہئے وہ ایک ایسا شخص ہے جو تنہا مشعل لیے نکل پڑا ہے اور اندھیرے کو دور کر رہا ہے میرے ایک دوست نے کہاوہ تنہا نہیں ہے ایک انجمن ہے ۔تو پھر اس جیسے لوگ اور کہاں ہیں جنگل......گاؤں......یادوسرے شہر میں......شہر تو جنگل میں تبدیل ہو رہا ہے اور یہاں بسنے والے جنگلی جانور بنتے جارہے ہیں ۔گاؤں میں بھی شہر کی آب وہوا پہنچ چکی ہے ۔سوشل میڈیا کا زمانہ ہے جو کچھ شہر میں ہوتا ہے پلک جھپکتے گاؤں تک پہنچ جاتا ہے بلکہ ہر گھر میں پہنچ جاتا ہے ہر کے ہاتھ میں ایک دنیا ہے اور دنیا میں اچھے لوگ بھی ہیں برے لوگ بھی ہیں ۔اچھائی دب جاتی ہے اور برائی سر چڑھ کر بولتی ہے ۔

میں ایک بار پھر اس تصویر کو دیکھنا چاہتا ہوں ۔اس کا ربر ہٹایا اور پھیلا دیا۔لہو کے دھبے ماند پڑنے لگے تھے ۔اس کی آنکھوں کے انگارے بھی غائب ہو گئے تھے ۔اس تصویر کو اسی طرح لپیٹ کر رکھ دیا اور کینوس پر آرٹ پیپر لگایا۔ پہلے ایک ہاتھ بنایا پھر اس کا جسم ۔اس بار چہرہ چھوڑ دیا۔ چہرہ بعد میں بناؤں گا کہ کہیں پھر اس کی آنکھیں انگارے نہ اگلنے لگے ۔میں نے تصویر ادھوری چھوڑ دی اور سونے کے لیے چلا گیا۔رات میں جب آنکھ کھلی اور کمرہ کی روشنی جلائی تو دیکھا اس کے ہاتھ میں مشعل ہے اور اس سے آگ کی لپٹیں نکل رہی ہیں ۔میں محو حیرت تھا کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے ۔میں پریشان تھا......مگر اس کا ذکر کسی سے کر بھی نہیں سکتا تھا لوگ میرا ہی مذاق اڑائیں گے اس بارے میں بہت سوچا کہ میرے ساتھ یہ کیوں ہو رہا ہے ۔بہت غور وفکر کرنے کے بعد میں اپنے آرٹ کے استاد کے پاس پہنچ گیا کہ ان سے اس بارے میں مشورہ کروں ۔ان کو تمام باتوں کی جانکاری دی ۔بہت دیر تک سوچتے رہے پھر وہ اپنے اس کمرہ میں لے گئے جہاں وہ تصویریں بناتے تھے ۔جہاں ان کی بہت ساری تصویریں موجود تھیں ۔انہوں نے ایک تصویر اٹھائی اس کا ربر کھولا اور میری آنکھوں کے سامنے پھیلا دیا۔ٹھیک اسی طرح کی تصویر تھی جیسی میں نے بنائی تھی ۔اس کی آنکھوں سے انگارے نکل رہے تھے اور لہو کے دھبے اسی طرح موجود تھے پھر دوسری تصویر دکھائی جس میں وہی ہاتھ تھا وہی مشعل اور وہی شعلہ ۔میں حیرت میں ڈوب گیا۔انہوں نے میری طرف دیکھ کر کہا:

"برسوں سے ان دو تصویروں کو بنا رہا ہوں لیکن ابھی تک مکمل نہیں ہو سکی ہے ۔"

میں حیرت سے کبھی ان تصویروں کو دیکھتا اور کبھی اپنے استاد کو ۔جب میرے استاد کامیاب نہیں ہوئے تو کیا میں کامیاب ہو پاؤں گا۔میں اپنے کمرہ میں لوٹ آیا۔کینوس پر پھر سے اس نامکمل تصویر کو لگایا بہت سوچنے کے بعد بھی اس کا چہرہ نہیں بنا پایا۔جب میں بری طرح تھک گیا تو سونے کے لے چلا گیا۔میں گہری نیند میں تھا کہ کمرہ میں شور سنائی دیا۔میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور کمرہ کا جائزہ لیا لیکن کمرہ میں کوئی نہیں تھا پھر یہ شور کہاں سے آرہا ہے ۔میں دروازہ کھول کر باہر جا کر دیکھنا چاہتا ہوں لیکن ایسا نہیں کر سکا۔میں نے کھڑکی کھول کر سڑک کی طرف دیکھا۔سڑک سنسان پڑی تھی ۔میں نے کھڑکی بند کر دی اور جیسے ہی سونے کے لئے جانے لگا تو دیکھا کہ جو تصویر کینوس پر لگی تھی اس میں اسی آدمی کا چہرہ نظر آیا جس کی آنکھیں انگارے اگل رہی تھیں ۔اور ایک نہیں کئی مشعلیں اس کے ہاتھ میں تھیں اور سب سے شعلے اگل رہے تھے ۔میں نے جلدی سے اس تصویر کو دیکھا جو پہلے بنائی تھی ۔اس تصویر سے اس کا چہرہ غائب تھا اور لہو کے نشان بھی مٹ چکے تھے ۔تصویر میرے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑی ۔لیکن اس بات کی خوشی تھی کہ تصویر مکمل ہو گئی تھی ۔اب میں اسے فریم کرا کر اپنے کمرہ میں ٹانگنا چاہتا تھا۔دوسرے دن اسے فریم کرایا اور کمرہ کی دیوار پر آویزاں کر دیا۔اب مجھے قدرے اطمینان تھا کہ کسی طرح سے تصویر مکمل ہو گئی ۔میں اس رات آرام کی نیند سویا بلکہ دیر تک سوتا رہا۔جب صبح میری آنکھ کھلی تو سب سے پہلے میری نظر اس تصویر پر گئی ۔میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ فریم سے تصویر غائب تھی اور خالی فریم میرا منھ چڑھا رہا تھا۔

❑❑❑

غزل

جو ماں کے قدموں میں اپنی حیات دیکھیں گے
وہ اپنے قدموں میں کل کائنات دیکھیں گے

لو میں نے تھوڑا سا غصہ دلا دیا ہے انھیں
ہیں کتنے پانی میں عالی صفات دیکھیں گے

وہ اک نظر جو کبھی دو بدو ہوئی ہم سے
اب اس نظر کا اثر تا حیات دیکھیں گے

یوں ہم کسی کو بھی دشمن نہیں بنا سکتے
مخالفت میں بھی ہم ذات پات دیکھیں گے

یہ "لاابالی" کا الزام ہم غریبوں پر
ہے کتنی دیر کا تیرا بھی ساتھ دیکھیں گے

بہت دنوں سے نگاہوں سے میری اوجھل ہے
وہ کیسا دکھتا ہے یہ چاند رات دیکھیں گے

زمانہ مجھ کو سمجھتا ہے کامیاب بہت
خود اپنے آپ کو اب دے کے مات دیکھیں گے

ظہیر الہ آبادی
حضرت گنج، منجھن پور، کوشامبی
7060660529

درفشاں چاندنی

وائٹنگن ہومز،فان بریک ایونیو،سروجنی نائیڈو مارگ لکھنؤ

9451065144

افسانہ

اجر

''دن گزرتے گئے وقت اپنی رفتار سے آگے بڑھتا گیا آخر وہ دن بھی آیا جس کا انتظار گھر کے سبھی لوگوں کو تھا آج ثناء کی شادی کی تقریب میں انا خوبصورت لباس میں تتلی کی مانند اِدھر اُدھر گھوم گھوم کر اپنی سبھی ذمہ داریوں کو نبھا رہی تھی برات آ گئی تھی بس تھوڑی دیر بعد ہی نکاح ہونے والا تھا لیکن ثناء ابا ابا کی رٹ لگائے رو رہی تھی سبھی پاس بیٹھی سہیلیاں اسکو سمجھا کر چُپ کرانے کی پوری کوشش کر رہی تھیں ،تبھی باہر سے ایک خاتون دلہن کے کمرے میں داخل ہوتی ہوئی بولی سب لڑکیاں ایک طرف ہو جاؤ نکاح ہونے جا رہا ہے قاضی صاحب دلہن کے حجرے میں گھر خاندان کے کُچھ لوگوں کے ساتھ داخل ہوئے تبھی وہاں پر کُچھ سگبگاہٹ ہونے لگی۔کئی لوگ ایک انجان شخص کی جانب دیکھ کر آپس میں کانا پھوسی کر رہے تھے تبھی کسی نے سب سے خاموش رہنے کی درخواست کی کُچھ لمحوں کے لئے سنّاٹا چھا گیا قاضی صاحب نے نکاح کی رسم مکمل کی اور وہ باہر چلے گئے''۔

انا نے دروازے پر پہنچ کر گھنٹی بجائی دادی اماں نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر کی طرف جھانکا پھر ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ دروازہ کھول دیا،اُسنے دادی کو دھیمی آواز میں سلام کیا اور پھر تیز قدم بڑھاتی ہوئی سامنے کے کمرے میں داخل ہوگئی۔اپنی پیٹھ پر لدا ہوا بھاری بستہ پاس میں رکھی میز پر رکھا اور اسکول یونیفارم تبدیل کئے بغیر ہی اوندھے منہ بستر پر گر کر سسکیاں بھرنے لگی آنسوؤں کی زیادتی کے سبب چہرے کے نیچے دبا ہوا تکیہ کافی گیلا ہو گیا تھا،تب ہی دادی نے شفقت بھرا ہاتھ اُسکے سر پر پھیرا تو وہ جھٹ سے اُٹھی اور دادی سے لپٹ کر اور بھی زیادہ زور سے رونے لگی،کیوں اب آج پھر کیا ہوا؟ دُدا آج پھر شبنم نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ مل کر سب کے سامنے میرا مذاق اڑایا۔اب میں اسکول نہیں جاؤنگی! پھر وہی۔میں نے سمجھایا تھا نا کہ مذاق اڑ انا اللہ کو بالکل بھی پسند نہیں،میری گڑیا روز اسکول جائے گی،کبھی بھی ناغہ نہیں کرے گی۔

دُدا کا کہنا مانے گی پھر اللہ میاں اُسکو بہت اچھا انعام دینگے۔دادی نے معصوم انا کے آنسو پونچھ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور ہمیشہ کی طرح دادی سے اپنی دل پسند لوری سنتے سنتے وہ نیند کی آغوش میں سما گئی،دُدا مجھ کو بھی کہانی اور لوری،سننا ہے انا کی جڑواں بہن ثناء بھی دادی کے زانو پر سر رکھ کر لیٹ گئی،دونوں بہنوں میں دادی کی جان بستی تھی،اور دونوں پوتیوں کی جان دادی میں اٹکی رہتی،ماں کے آفس جانے کی وجہ سے دونوں بیٹیوں کو انکا ساتھ اور وقت بہت کم ملتا،اکثر اور بیشتر ہفتے کا دن یا پھر کوئی چھٹی کے دن ہی سب ساتھ میں رہتے۔جڑواں ہونے کے باوجود دونوں بہنیں شکل وصورت میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھیں آپس میں وہ دونوں خوب مل جُل کر رہتیں کبھی لڑ کر ایک دوسرے سے ناراض ہوتیں تو کُچھ ہی دیر بعد فوراً ہی میل کر لیتیں،اکثر دونوں بہنیں اپنے والد کے بارے میں باتیں کرتے کرتے افسردہ ہو جاتیں،کبھی دادی تو کبھی ماں سے جاننا چاہتیں کہ سب کی طرح میرے ابا کیوں نہیں ہمارے ساتھ رہتے؟ وہ کب واپس آئیں گے؟ بس جلدی ہی واپس آئیں گے،ماں کا وہی گھسا پٹا جواب سن کر تھوڑی مایوسی اور تھوڑی اُمید کے ساتھ صبر کا دامن پکڑ کر چپ ہو جاتیں، اللہ میاں میرے ابا جلدی سے واپس گھر آ جائیں،ننھے ننھے ہاتھوں کو بلند کر کے دونوں بہنیں ایک ساتھ دعا مانگتیں،اور پھر باپ کی تصویر کو ہاتھ میں پکڑے پکڑے دونوں معصوم بچیاں ایک ایک کر نیند کی باہوں میں جھولا جھولتے جھولتے خوابوں کی دنیا میں پہنچ گئیں،ماں نے اپنے شوہر کی تصویر اُٹھا کر سینے سے لگا یا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی،یا اللہ میں کیا کروں اب مُجھ سے جھوٹ بھی نہیں بولا جاتا،بیٹیاں سمجھ دار ہو گئی ہیں اب میں کیا کروں؟

لو بیٹا دوا پی لو،ماں نے کئی برس سے بیمار بیٹے طلاط کو دوا پلانے کی کوشش کی لیکن وہ ہر مرتبہ ماں کا ہاتھ پیچھے واپس کر دیتا جیسے دوا پی کر تھک چکا ہو،ماں نے جیسے ہی پھر دوبارہ کوشش کی ساس اور شوہر صابر ایک ساتھ بول پڑے جب دوا سے فائدہ نہیں ہو رہا ہے تو مت پلاؤ،پھر میں کیا کروں کیسے ٹھیک ہو گا میرا بچہ،؟ میں کُچھ کرتا ہوں،صابر نے گاؤں کا گھر اور زمین سب کُچھ بیچ کر شہر میں مکان خرید لیا کہ شہر میں بیٹے کا اچھا علاج ہو جائے گا اور گاؤں سے شہر کی روز روز کی دوڑ بھی نہیں کرنا پڑے گی،لیکن لاکھ کوششوں کے باوجود بھی ۱۲ برس کے بیٹے کی موت کا درد گھر والوں کو برداشت کرنا ہی پڑا۔جہاں دل غم سے چور تھا وہیں مالی حالات بھی بہت خراب ہو گئے تھے بیٹے کے علاج میں پیسہ پانی کی طرح بہہ گیا،مجبور ہو کر صابر کو پیسہ کمانے کے لئے عرب ملک جانے کا فیصلہ لینا پڑا،گھبرانا نہیں میں پیسہ بھیجتا رہونگا گھر اور اپنا خاص خیال رکھنا نہیں تو آنے والا مہمان بھی کمزور پیدا ہو گا! شوہر کی غیر موجودگی کے خیال سے ہی اسکی ہمسفر رانا سحر اُٹھی صابر کے چلے جانے کے بعد وہ بہت حیران پریشان رہی تنہائی میں گھنٹوں روتی لیکن جلد ہی اُس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور سبھی ذمے داریاں بخوبی نبھانے میں کامیاب رہی،

پل پل اسے اپنے شوہر کا انتظار رہتا خاص کر جب اُس نے جڑواں بچیوں کو جنم دیا نرس نے رانا کے دائیں، بائیں دونوں بیٹیوں کو لٹا دیا ماں نے ممتا بھری نظروں سے دونوں بیٹیوں کو دیکھا اس بچی کا آپ کو خاص خیال رکھنا ہوگا کہتے ہوئے نرس نے داہنے جانب کو لیٹی بچی کے بدن سے تھوڑا کپڑا ہٹایا ارے یہ کیا؟ یہ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا ہے یہ؟ رانا زور سے چیخ پڑی!

ارے بیٹا کیا ہوا کیا کوئی ڈراونا خواب دیکھا ہے تم نے، ساس نے بہو کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا! بس یوں ہی آنکھ لگ گئی تھی امّی رانا نے اپنے دل کے درد کو ظاہر نہ کرنے کی پوری کوشش کی وہ بیتے دنوں کو یاد کرتے کرتے کب خوابوں کی دنیا میں چلی گئی اُسے پتہ ہی نہیں چلا لیکن ساس نے بہو کے دل کی کیفیت کا پورا اندازہ لگا لیا اور محبت سے رانا کو گلے لگا کر روندھی آواز میں بولی صبر کرو بی بی اللہ سب ٹھیک کرے گا بیٹے کی یاد میں ماں کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ دن گزرے پھر سال اور مہینے جہاں رانا کے بالوں میں سفیدی مائل ہو چلی تھی وہیں انا اور ثناء زندگی کے اس دور میں قدم رکھ چکی تھیں جہاں اُمید، ارمان، اور حسین خوابوں کے گلستان و دلکش وادیوں میں ہر نوجوان دل اپنے خوابوں کی تعبیر تلاش کرتا ہے۔

ارے انا ذرا سنو! جی امّی بتائیے کیا بات ہے؟ تم دونوں کے امتحان کب ختم ہو رہے ہیں؟ بس اگلے ہفتہ کے آخری دن: ثناء کا رِشتہ آیا ہے ماں کی بات اُسکے دل پر ضرب کر گئی لیکن اُس نے اپنے دل کی کیفیت عیاں نہ ہونے دیا اور مصنوعی مسکراہٹ لیے ماں سے دوسری باتیں کرنے لگی لیکن ماں تو ماں ہوتی ہے بیٹی کے دل کو ممتا کی آنکھوں سے دیکھ دل و دماغ کا سارا حال سمجھ گئی اور آگے ابھی باتیں کرنا مناسب نہ سمجھا۔ رانا کو ایک طرف تو ثناء کا اچھا رشتہ آنے کی خوشی تھی تو دوسری طرف یہ بھی فکر تھی کہ ابھی تک جہاں سے بھی رشتہ آیا ہمیشہ ثناء کے لیے ہی آیا لیکن پھر بھی وہ نا اُمید نہ ہوئی اور ہمیشہ پروردگار سے اپنی بیٹی کے لیے دعا مانگتی رہی۔

مبارک ہو! مبارک ہو امّی بتا رہی ہیں کہ تمہارا رشتہ آیا ہے انا نے بہن کو چھیڑا مجھے نہیں کرنا ابھی شادی وادی سچ! انا نے ثناء کو پھر چھیڑا امی کہہ رہی تھیں کے شاید وہ لوگ جلدی ہی گھر پر تمہارا ہاتھ مانگنے آئیں گے: واہ کتنا مزہ آئے گا انا نے جھوم کر تالی بجائی ایک طرف تو انا خوش تھی کہ اسکی بہن اچھے گھر بیاہ کر جائے گی لیکن کہیں نہ کہیں دل کے کسی کونے میں ہلکی ہلکی چبھن بھی تھی کہ کبھی کہیں سے میرا رشتہ نہیں آئے گا آخر دل تو دل ہے کبھی نہ کبھی تو مچل ہی جاتا ہے۔

دن گزرتے گئے وقت اپنی رفتار سے آگے بڑھتا گیا آخر وہ دن بھی آیا جس کا انتظار گھر کے سبھی لوگوں کو تھا آج ثناء کی شادی کی تقریب میں انا خوبصورت لباس میں تتلی کی مانند اِدھر اُدھر گھوم گھوم کر اپنی سبھی ذمہ داریوں کو نبھا رہی تھی برات آ گئی تھی بس تھوڑی دیر بعد ہی نکاح ہونے والا تھا لیکن ثناء ابا ابا کی رٹ لگائے رو رہی تھی سبھی پاس بیٹھی سہیلیاں اس کو سمجھا کر چُپ کرانے کی پوری کوشش کر رہی تھیں تبھی باہر سے ایک خاتون دلہن کے کمرے میں داخل ہوتی ہوئی بولی سب لڑکیاں ایک طرف ہو جاؤ نکاح ہونے جا رہا ہے۔ قاضی صاحب دلہن کے حجرے میں گھر خاندان کے کُچھ لوگوں کے ساتھ داخل ہوئے تبھی وہاں پر کُچھ سگبگاہٹ ہونے لگی کئی لوگ ایک انجان شخص کی جانب دیکھ کر آپس میں کانا پھوسی کر رہے تھے تبھی کسی نے سب سے خاموش رہنے کی درخواست کی کُچھ لمحوں کے لئے سناٹا چھا گیا قاضی صاحب نے نکاح کی رسم مُکمل کی اور وہ باہر چلے گئے تبھی پردے کے اس پار بیٹھا شخص اچانک تیزی سے اندر دلہن کے کمرے میں داخل ہو جاتا ہے عورتیں بڑبڑا اٹھی ارے انکو باہر کرو یہاں پردے والی عورتیں بھی ہیں جہاں رانا، انا اور دادی ثناء کو لپٹا کر اُسکے آنسو پونچھ رہی تھی کہ ساتھ کھڑا آدمی بھرّائی آواز میں بمشکل بولا بیٹی کو گلے تو لگا لینے دو: صابر میرا بچہ! میرا لعل! ماں نے بیٹے کو گلے لگا لیا رانا اور انا کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے لبریز تھیں وہیں دلہن کے جوڑے میں لپٹی ثناء خوشی سے تھر تھر کانپ رہی تھی، ہنستے آنسوؤں کے ساتھ سبھی نے ثناء کو رخصت کیا ماں، بیوی اور بیٹیوں کے دل خوشی سے لبریز تھے۔ بہت عرصے بعد میرے چمن میں بہار آئی ہے کہتے ہوئے ماں کا چہرہ مسرت سے لبریز ہو گیا۔ شادی کا شور ختم ہوا۔ رانا نے اطمینان کی سانس لی اور اپنے خاوند سے عرب جیل میں گزارے اُن دنوں کے بارے میں باتیں کی جس کے ہر پل کو اُس نے انتہائی تکلیف میں گزارا سب سے زیادہ اُسے اس بات کا غم تھا کہ لاکھ کوششوں کے بعد بھی اس کا شوہر اپنی بے گناہی کو ثابت نہ کر سکا تھا اور اسکو اس گناہ کی سزا بھگتنی پڑی جو جرم اُس نے کیا ہی نہیں تھا لیکن اُس کی بے گناہی کو اس دیس کا قانون ماننے کو قطعی تیار نہیں تھا وہاں پردیس کی جیل میں بتایا وقت اُس کے دل و دماغ اور ضمیر پر ایسی گہری چوٹ تھی جسے اُس کے قلبی سکون کو ختم کر دیا تھا۔

کُچھ ہی وقت بعد انا کا بہت اچھے لڑکے کے ساتھ رشتہ آیا پہلے تو انا نے شادی سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کی اب مجھ کو نہیں سننا ہے کبڑی؛ کبڑی میرا نام تو باہر والے لیتے نہیں سب کبڑی ہی کہہ کر مجھ کو مخاطب کرتے ہیں اس میں میرا کیا قصور؟ مجھکو ہی کیوں اللہ نے ایسا بنایا؟ اُس کے دل کا درد چھلک پڑا۔ تاب بہت نیک باپ کی نیک اولاد ہے دادی بولیں کیا؟ اچانک انا کے چہرے کے تاثرات بدلے اور اُسکے ذہن میں گزرے کُچھ برسوں کے مناظر گھوم گئے یہ وہی لڑکا ہے جو لگاتار بیتے کئی برسوں سے اُسکے اسکول جانے کے راستے پر کھڑا ہو کر دھیرے سے کہتا "تم نیلی آنکھوں والی پری ہو یہ خط لے لو خدارا" لیکن انا ہمیشہ ہی اُسکی طرف دیکھے بغیر ہی آگے بڑھ جاتی وہ دل ہی دل میں خوشی سے جھوم اٹھی۔

ٹھیک ہے آپ لوگ جیسا چاہیں اور وہ خوشی میں لبریز اپنے کمرے کی جانب جا کر بستر پر اوندھے منہ لیٹ کر مسرت کے سیلاب میں غوطہ لگانے لگی۔

کُچھ ہی ماہ بعد انا کی شادی تاب کے ہمراہ خوب دھوم دھام سے ہو گئی اور ٹھیک ایک برس کے بعد انا نے دو جڑواں بچیوں کو جنم دیا دونوں جڑواں نوزائیدہ بیٹیاں ماں کے ارد گرد کپڑے میں لپٹی کلبلا رہی تھیں آپ کی بیٹیاں بالکل ٹھیک ہیں آپ بہت خوف زدہ تھیں کہ کہیں بچے آپ کی طرح نہ ہو جائیں لیکن قدرت کی شان تو دیکھئے آپ بیٹیوں کی طرح ہو گئی ہیں بالکل ٹھیک آپکو اُوپر والے نے آپکی تکلیفوں اور صبر کا کیسا اچھا اجر عطا کیا ہے کی آپ کا کوبڑ پوری طرح سے غائب ہو گیا ہے میرا انعام تو بنتا ہے بی بی جی پاس کھڑی ہسپتال کی آیا نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ہاتھ پھیلایا انا کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ رانا نے فوراً پرس کھول کر آیا کو ڈھیر سارے پیسے دیئے۔! رانا کو انا کی پیدائش کا وہ دن یاد آ گیا جب انا کو دیکھ کر وہاں کے بہت قابل ڈاکٹر نے کہا تھا کہ آپ کے بچے کو کوئی بیماری نہیں ہے یہ جسمانی کمی ہے جو آلودہ آب و ہوا اور گندے پانی کے سبب ہوتی ہے اُوپر والے پر بھروسہ رکھئے یہ آپ کے گاؤں سونا پور اور اُس کے آس پاس علاقوں سے اسی طرح کے کیس آ رہے ہیں وہاں کی کیمیکل فیکٹری کی گندگی اور ملبہ اس کا خاص سبب ہے بستر کے پاس کھڑی ثناء نے جھک کر بہن کا ماتھا چوم لیا یہ سب میرے گھر والوں کی دعاؤں کا اثر ہے جی میڈم میں جو دعائیں کرتے کرتے تھک گیا میرا کوئی نام ہی نہیں انا کے شوہر تاب نے چٹکی لی، اب تو آپ ہی سب کچھ ہیں۔ آپ کے بغیر تو کچھ بھی نہیں! کیا پتہ کی بات کہی میری بیٹی نے! صابر کے کہنے پر سبھی گھر والے ہنس پڑے صابر کی والدہ اور بیٹیوں کی دادی ہاتھ میں تسبیح لئے ابھی بھی مسکراتی ہوئی دعائیں پڑھے جا رہی تھیں۔

❑❑❑

ہاشمی رضوی

کاظمین روڈ، منصورنگر، لکھنؤ

9792361988

ملک میں صنعتی سرمایہ کاری کے لیے یوپی بہترین مقام

اتر پردیش ملک میں صنعتی سرمایہ کاری کے لیے بہترین جگہ ہے۔ ریاست کے پاس پانی کے بہترین وسائل ہیں، ریاست میں کافی لینڈ بینک موجود ہے۔ صنعتی سرمایہ کار مختلف شعبوں میں سرمایہ کاری کے امکانات کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔ ریاست میں کی جانے والی ہر سرمایہ کاری محفوظ ہوگی اور سرمایہ کاروں کو نتیجہ خیز بنانے میں بھی مدد ملے گی۔

وزیر اعلیٰ نے یوپی گلوبل انوسٹرس سمٹ-2023 کے انعقاد کے موقع پر 'یونائیٹڈ کنگڈم (یو کے) پارٹنر کنٹری/ ڈیفنس سیشن' میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ برطانیہ کی حکومت سے اظہار تشکر کرتے ہوئے UPGIS-2023 کو کامیابی کی نئی بلندیوں تک لے جانے کے لیے ایک پارٹنر ملک کے طور پر برطانیہ کی شرکت اور شراکت ہمارے لیے بیحد اہم ہے۔ انہوں نے کہا کہ UPGIS-2023 سے قبل ریاستی حکومت کے وزراء کے گروپ کی طرف سے دنیا کے 16 ممالک اور ملک کے 10 بڑے شہروں میں روڈ شوز کا انعقاد کیا گیا تھا تاکہ ریاست کی سرمایہ کاری کے لامحدود امکانات کو آگے بڑھایا جاسکے۔ ریاست کے تمام 75 اضلاع میں مقامی سطح پر عوامی نمائندوں کی شرکت سے سرمایہ کار کانفرنسوں کا انعقاد کیا گیا۔ اس لیے آج UP GIS اپنی کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔

وزیر اعلیٰ نے کہا کہ UP GIS-2023 شراکت دار ممالک کے تعاون سے کامیاب رہا ہے۔ ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات مضبوط تاریخی پس منظر کے حامل ہیں۔ وزیر اعظم جناب نریندر مودی نے ان دوطرفہ تعلقات کو اعلیٰ سطح پر لے جانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج برطانیہ سے وابستہ تمام سرمایہ کار UPGIS-2023 میں حصہ دار بن رہے ہیں۔ برطانیہ کے ڈیفنس پروکیورمنٹ منسٹر اپنے وفد کے ساتھ ریاست میں ان امکانات کو آگے بڑھانے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اتر پردیش ایک ایسی ریاست ہے جس میں لامحدود امکانات ہیں۔ یہ ملک کی سب سے زیادہ آبادی والی ریاست ہے، جہاں 25 کروڑ لوگ رہتے ہیں۔ ریاست میں 96 لاکھ ایم ایس ایم ای یونٹ ہیں، جو صنعتی سرمایہ کاری کی بنیادی شرائط کو پورا کرتے ہیں۔ یہ ریاست کے نوجوانوں کو روزگار فراہم کر رہا ہے اور انہیں خود کفیل اور خود انحصار بننے میں مدد فراہم کر رہا ہے۔ ریاست کی روایتی صنعتوں کی حوصلہ افزائی کے لیے انہیں 'ایک ضلع ایک پروڈکٹ' (ODOP) اسکیم کے ذریعے فروغ دیا جارہا ہے۔ اس کے تحت ریاست کے ہر ضلع کی اپنی منفرد مصنوعات ہیں۔

وزیر اعلیٰ نے کہا کہ اتر پردیش ملک میں زرعی پیداوار کا ایک اہم مرکز ہے۔ ملک کی کل قابل کاشت آراضی میں ریاست کا حصہ 11 فیصد ہے، جب کہ ملک کی مجموعی غذائی اجناس کی پیداوار میں ریاست کا حصہ 20 فیصد ہے۔ ملک میں سب سے زیادہ غذائی اجناس کی پیداوار کے ساتھ گنے اور دودھ کی پیداوار میں اتر پردیش پہلے نمبر پر ہے۔ ملک کے دیگر شعبوں میں بھی اتر پردیش کا اہم

رول ہے۔ انہوں نے کہا کہ ریاست کو ترقی کی نئی پرواز دینے کے لیے 25 شعبوں پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ ان میں دفاع اور ایرو اسپیس کے شعبے ترجیحات میں شامل ہیں۔ حکومت ہند کے ساتھ مل کر اسے تیزی سے آگے بڑھایا جارہا ہے۔ ریاستی حکومت نے اپنی دفاعی اور ایرو اسپیس پالیسی بھی جاری کی ہے، جس کے تحت ہم ان امکانات کو آگے بڑھانے کے لیے کام کر رہے ہیں۔

وزیر اعلیٰ نے کہا کہ صنعتی سرمایہ کاری اور روزگار سے متعلق اتر پردیش کی پالیسی آپشن پر مبنی پالیسی ہے، جو سرمایہ کاروں کو مدد فراہم کرتی ہے۔ ریاستی حکومت اس پالیسی کے تحت سرمایہ کاروں کو محفوظ سرمایہ کاری کی ضمانت دینے اور اسے ریاست کے لوگوں کے لیے مفید بنانے کے لیے پوری طرح پابند ہے۔ UK نے شراکت دار ملک کے طور پر UPGIS-2023 میں تعاون کیا ہے۔ برطانیہ کے سرمایہ کاروں کو ریاستی حکومت کی جانب سے دفاع، ایرو اسپیس اور فوڈ پروسیسنگ کے شعبے میں بہتر انداز میں آگے بڑھانے میں مکمل مثبت تعاون حاصل ہوگا۔ اس موقع پر برطانوی حکومت کے ڈیفنس پروکیورمنٹ منسٹر مسٹر ایلکس چاک کیسی نے کہا کہ ہندوستان دنیا کا سب سے متنوع اور روادار ملک ہے۔ ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان اچھے تعلقات ہیں۔ ہندوستان کی معیشت تیزی سے ترقی کر رہی ہے۔ اس ملک کا مستقبل روشن ہے، جبکہ اتر پردیش ایک بہترین ریاست ہے۔ وہ ریاست کی ترقی کے سفر میں حصہ دار بننے کے خواہشمند ہیں۔ راجدھانی لکھنؤ میں منعقدہ یوپی GIS-2023 میں حصہ لینا ان کے لیے فخر کی بات ہے۔ اب UK-UP 'سب کا ساتھ سب کا وکاس' ہوگا۔ برطانیہ دفاعی شعبے میں اپنی شراکت داری کے لیے پرعزم ہے۔

❑❑❑

جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ انویسٹ یو پی کتابچہ کا اجراء کرتے ہوئے۔

جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ دیوریا میں بزرگ خاتون کو 'ناری شکتی وندن' اسکیم کارڈ سے نوازتے ہوئے۔

वर्ष : 77 अंक 10
फरवरी, 2023
मूल्य : 15 रु./–
वार्षिक मूल्य : 180 रु./–

उर्दू मासिक, **नया दौर**
पोस्ट बॉक्स सं0 146,
लखनऊ – 226 001

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल0 डब्लू/एन0 पी0/101/2006–08
ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. स्वत्वाधिकारी के लिए शिशिर, निदेशक, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. लखनऊ द्वारा प्रकाशित तथा प्रकाश एन. भार्गव, प्रकाश पैकेजर्स, प्रथम तल, शगुन पैलेस, 3–सप्रू मार्ग, लखनऊ द्वारा मुद्रित, सम्पादक– **रेहान अब्बास**